© rasailojaraid.com

شلوار اور پتلون کے پائینچوں کا شرعی حکم ۔ ایک تحقیق

(دوسری اور آخری قسط)

محمد عارف خان ساقی

لیکچرر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

بلا قصدِ تکبر ممنوع نہیں

احادیث مبارکہ میں اس بات کی بھی وضاحت ملتی ہے کہ بلا ارادۂ تکبر تہمد کے لٹکانے یا ایسا ہو جانے کا معاملہ احادیث میں وارد وعیدوں کی زد میں نہیں آتا۔ حدیث رسول ﷺ پر غور فرمایئے:

عن سالم بن عبداللہ عن ابیہ قال قال رسول اللہ ﷺ من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیمۃ فقال ابو بکر رضی اللہ عنہ: ان احد جانبی ازاری یسترخی الا ان اتعاھد ذلک منہ۔ قال: لست ممن یفعلہ خیلاء۔

(سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار)

ترجمہ: حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ازراہِ تکبر کپڑا گھسیٹا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی جانب نظرِ کرم نہیں فرمائے گا۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ میرے تہمد کا ایک کنارہ ڈھلک جاتا ہے مگر خیال رکھنے کی میں اپنی سی کرتا رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ازراہِ تکبر کرتے ہیں۔

یہ خیال رہے کہ اس حدیث شریف میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے الفاظ میں اس امر کی صراحت بھی موجود ہے کہ خیال رکھنے کی میں اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ

ہوا کہ مسلسل دیکھ بھال کرتے رہنے کا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تہیہ فرما رکھا تھا۔ یہ آپ کے غیر معمولی تقویٰ کا مظہر ہے۔ آپ کا یہ عمل قطعی غیر ارادی تھا اور غرور تکبر یا شان و شوکت کے اظہار کا اس میں شائبہ تک نہ تھا بلکہ تکبر سے آپ کی بیزاری اور عدم دلچسپی کا ایک واضح اعلان تھا۔ علامہ ملا علی قاری اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمعنی ان استرخائہ من غیر قصد لا یضر لا سیما ممن لا یکون من شیمتہ الخیلاء ولکن الافضل ھو المتابعۃ وبہ یظھر ان سبب الحرمۃ فی جر الازار ھو الخیلاء۔ (مرقات، جلد ہشتم، صفحہ ۶۵۔۲۶۴، مکتبۂ امدادیہ۔ ملتان)

ترجمہ: اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلا ارادہ تہمد لٹکانے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ خصوصاً اس آدمی کے لئے جس کی عادت میں تکبر شامل ہی نہ ہو۔ لیکن فضیلت پیروی ہی میں ہے۔ اس طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ تہمد گھسیٹنے کی حرمت کا سبب تکبر ہی ہے۔

غلط فہمی یا مغالطہ آرائی؟

تہمد تو ہے ہی کھلا ڈھلا لباس۔ غرور تکبر کے اظہار کے رسیا آسانی اسے گھسیٹنے کے جرم بے لذت کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ قمیص کے معاملے میں بھی دامن کو اتنا لمبا رکھا جا سکتا ہے کہ چلتے وقت پیچھے پیچھے گھسیٹتا چلا آئے جسے عربی میں "ارقال" کہتے ہیں۔ اسی طرح عمامے کا ایک سرا بھی اتنا لمبا رکھا جا سکتا ہے کہ زمین کو چھولے۔ نظر بریں اس حدیث کے فوائد کے ضمن میں علامہ وحید الزماں کی اس رائے میں بھی کسی قدر مبالغے کا عنصر موجود ہے۔ اہل علم کی اس نوع کی غلطیاں آگے چل کر مغالطہ آرائی کی بنیاد بن جایا کرتی ہیں۔ علامہ کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"اسبال کے معنی نیچے لٹکانا ازار وغیرہ کو تکبر سے۔ یعنی نہی اسبال صرف ازار ہی میں نہیں بلکہ کرتے، اور پگڑی وغیرہ میں بھی آئی ہے۔ ازار کی حد ساق (پنڈلی) کے نیچے سے ٹخنے تک اور آستین کی حد گٹے سے انگلیوں کی گرہ تک اور پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ تک درست ہے۔ اور باقی سب تکبر کی شان ہے"۔ (سنن ابوداؤد، مترجم، جلد سوم، صفحہ ۲۶، اسلامی اکادمی، لاہور)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسبال نے آستینوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ مقصود سے قطعاً ہٹی ہوئی بات ہے اور نظر انداز کئے جانے کے لائق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علت حکم

محدثین کرام نے اس باب میں بکثرت احادیث حاصل اور محفوظ کی ہیں۔ فجزاهم الله عنا. صرف امام مسلم نے کتاب اللباس کے ایک باب "تحریم جر الثوب الخیلاء" میں اٹھائیس مختلف اسناد کے ساتھ جو احادیث وارد کی ہیں ان میں سے صرف دو احادیث ایسی ہیں جن میں تکبر کی قید کا کوئی ذکر نہیں۔ باقی تمام احادیث مقید ہیں۔ امام ابو عبداللہ یزید ابن ماجہ ربعی قزوینی کی مقید اور غیر مقید دونوں طرح کی روایات میں سے دو ملاحظہ فرمائیے:

عن حذیفة قال اخذ رسول الله ﷺ باسفل عضلة ساقی او ساقه فقال هذا موضع الازار فان ابیت فاسفل فان ابیت فلا حق للازار فی الکعبین۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب موضع الازار این ہو؟)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمان سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے میری یا (شک راوی ہے) اپنی پنڈلی کے نچلے حصے کو ہاتھ میں لیا اور فرمایا: ازار کی حد یہ ہے۔ تو اگر تمہارا دل نہ مانے تو کچھ نیچے، پھر نہ مانے تو کچھ اور نیچے، پھر بھی نہ مانے تو پھر ٹخنوں پر ازار کا کوئی حق نہیں ہے۔

عن ابی سلمة عن ابی هریرة قال مر بابی هریرة رضی الله عنه فتی من قریش یجر ثوبه فقال: یا ابن اخی انی سمعت رسول الله ﷺ یقول: من جر ثوبه من الخیلاء لم ینظر الله الیه یوم القیمة ۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب من جر ثوبہ من الخیلاء)

ترجمہ: حضرت ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ قریش کا ایک نوجوان اپنا کپڑا گھسیٹتا ہوا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے سے گزرا۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جو اپنا کپڑا ازراہ تکبر گھسیٹتا پھرے گا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کی نظر ہی نہ فرمائے گا۔

امام مسلم کی ایک روایت میں قید مؤکد ملاحظہ کیجئے:

عن ابن عمر انه رأى رجلا یجر ازاره فقال ممن انت؟ فانتسب له فاذا رجل من بنی لیث، فعرفه ابن عمر فقال: سمعت رسول الله ﷺ باذنی هاتین یقول: من جر ازاره لا یرید بذالك الا المخیلة فان الله لا ینظر الیه یوم القیامة ۔ (صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب اللباس، باب تحریم جر الثوب، صفحہ ۱۹۵، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنا تہمد گھسیٹ رہا تھا تو اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے اپنی قبائلی نسبت کا اظہار کیا تو پتا چلا وہ بنو لیث کا آدمی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے اپنے ان کانوں سے سنا ہے: جو شخص تہمد گھسیٹ کر چلے گا، اس سے اس کا مقصود تکبر کے سوا کچھ نہ ہو، تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس پر کرم کی نظر ہی نہیں فرمائے گا۔

لہٰذا خیال رہے کہ احادیث مبارکہ میں کہیں کہیں مطلقاً کپڑا گھسیٹنے کا ذکر ملتا ہے جبکہ کہیں کپڑا گھسیٹنے کے عمل کو "خیلاء" یا "بطر" کے لفظوں کے ساتھ مقید کرتے ہوئے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ممانعت یا حرمت کی علت یہی ہے۔ یعنی "اسبال بغرض تکبر" اور جہاں جہاں مطلق کپڑا گھسیٹنے کی ممانعت آئی ہے، انہیں بھی مقید ہی پر محمول کیا جائے گا۔ معروف شارح حدیث اور مفسر قرآن استاذی و ملاذی علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے اس بحث میں مطلق کے مقید پر حمل کو واجب لکھا ہے۔ شیخ یحییٰ بن شرف نووی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جن احادیث میں مطلقاً آیا ہے کہ جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو وہ جہنم میں ہے اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو تکبر کی وجہ سے لٹکایا گیا ہو۔ کیونکہ یہ احادیث مطلق ہیں اور مطلق کو مقید پر حمل کرنا واجب ہے"۔ (شرح صحیح مسلم، جلد ششم، صفحہ ۳۹۲، فرید بک اسٹال۔ لاہور) (علامہ نووی، شرح صحیح مسلم، جلد دوم، صفحہ ۱۹۵، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

خواتین کے لئے اسبال کا جواز

خواتین کے معاملے میں پہلی ترجیح چونکہ پردہ ہے اور اسبال اس معاملے میں ممد و معاون ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے بھی بصراحت خواتین کو اس کی اجازت دی ہے:

عن صفية بنت عبيد رضی الله عنهما انها اخبرته ان ام سلمة (رضی الله عنها) زوج النبی ﷺ قالت لرسول الله ﷺ حین ذکر الازار فالمرأة یا رسول الله ﷺ؟ قال: ترخی شبرا قالت ام سلمة رضی الله تعالیٰ عنها اذا ینکشف عنها۔ قال: فذراع لا تزید علیه ۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی الذیل)

ترجمہ: حضرت صفیہ بنت ابو عبید سے روایت ہے کہ جب تہمد کا ذکر چلا تو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! عورت کیا کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالشت بھر ڈھیلا رکھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی: پھر پردہ تو نہ رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو ایک ہاتھ (کہنی تک) اس سے زیادہ نہ کرے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں:

اجمع العلماء علی جواز الاسبال للنساء وقد صح عن النبی ﷺ الاذن لهن فی ارخاء ذیو لهن ذراعا ۔ (صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب اللباس، شرح باب تحریم جر الثوب، صفحہ ۱۹۵، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: خواتین کے لئے اسبال۔ کے جواز پر علماء کا اجماع ہے۔ اور ایک ہاتھ تک کپڑوں کو ڈھیلا چھوڑنے کی ان کے حق میں اجازت حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔

اسبال وارفال عرفی اصطلاحات ہیں

معروف محدث اور شارح حدیث شیخ یحییٰ بن شرف نووی شافعی کے نزدیک اسبال سے مراد کیا ہے؟ آپ کے اس قول سے واضح ہے:

المسبل ازاره فمعناه المرخی له الجار طرفه خیلاء ۔ (صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الایمان، شرح باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ ۷۱، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: ''اپنے تہبند کے معاملے میں اسبال کا ارتکاب کرنے والا'' سے مراد وہ شخص ہے جو اسے ڈھیلا چھوڑ دے اور ازراہِ تکبر اس کے کنارے کو گھسیٹے۔

صاحب المنجد نے اسبال کا معنی ''لٹکانا'' یا ''ڈھیلا چھوڑنا'' لکھا ہے۔ اسی طرح مفردات میں علامہ راغب اصفہانی نے بھی یہی معنی بیان فرمائے ہیں (دیکھئے: مادہ س ب ل) بعض عرب نوجوان ازراہِ تکبر اپنا تہبند گھسیٹ کر بڑے ناز نخرے کے ساتھ چلا کرتے ہیں اور اس عمل کو بھی اسبال کہا جاتا تھا۔ بلکہ بعض کے دماغ میں تو قمیص کے دامن تک کو گھسیٹنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ یہ عمل ارفال کہلاتا تھا۔

تابط شرا اپنے ماموں کے مرثیہ میں کہتا ہے:

مسبل فی الحی احوی رفلٌ
واذا یغزو فسمع ازل

(دیوان الحماسہ، باب المراثی، فی قول تابط شرا صفحہ ۲۱۷، المکتبہ السلفیہ لاہور)

ترجمہ: (شاعر کا ممدوح) قبیلے میں قمیص کا دامن اور تہبند گھسیٹ کر چلنے والا چوڑے چکلے بدن کا آدمی ہے۔

اور جب جنگ پر نکلتا ہے تو بھیڑیے کے بھورے تیلے بچے سے کم نہیں۔

جاہلانہ طور طریقوں اور اسلامی عادات واطوار کے مابین فرق کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کس خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اسبال عہد جاہلیت کے عرف کا حصہ تھا اور اس کے معنی ومفہوم سے سب واقف تھے چنانچہ احادیث مبارکہ میں اسبال کا معنی وہی ہے جو شیخ یحییٰ بن شرف نووی شافعی کے حوالے سے اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی ''تہبند کو بغرض تکبر'' اس قدر ڈھیلا چھوڑ دینا کہ زمین سے جا لگے اور گھسٹتا رہے۔ گویا اسبال ایک عرفی اصطلاح ہے جو اپنے لغوی معنی سے قدرے مختلف معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ جس معنی میں یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر موجود ہے۔ سطور بالا میں ہم ایسی متعدد احادیث بمع متن وترجمہ ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ یحییٰ بن شرف نووی شافعی نے دوسرے مقام پر اسبال کے حوالے سے فقہی مسئلے کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

الاسبال یکون فی الازار و القمیص والعمامة وانه لا یجوز اسباله تحت الکعبین ان کان للخیلاء ۔ فان کان لغیر ها فهو مکروه، وظواهر الاحادیث بالجر خیلاء تدل علی ان التحریم مخصوص بالخیلاء ۔ (صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب اللباس، شرح باب تحریم جر الثوب صفحہ ۱۹۴ قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: ''اسبال'' تہبند، قمیص اور پگڑی میں ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اگر تکبر کی خاطر ہو تو انہیں ٹخنوں سے نیچا چھوڑنا جائز ہی نہیں۔ اور اگر وجہ کوئی اور ہو تو مکروہ ہے اور ازراہِ تکبر گھسیٹنے کے معاملے میں احادیث کی اس امر پر نشاندہی بالکل واضح ہے کہ حرمت تکبر کے ساتھ مخصوص ہے۔

تاویل یا مغالطہ آرائی

یہ تمام باتیں ان کپڑوں سے متعلق ہیں جن میں اسبال ممکن ہو۔ پاجامہ، شلوار، یا پتلون میں اسبال ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ یہ سلے ہوئے لباس ہیں اور عادۃً ان کا پائینچا اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اگر ننگے پاؤں ہموار جگہ پر کھڑا ہو جائے تو پائینچے کا اگلا حصہ زیادہ سے زیادہ پاؤں کی پشت سے جا لگتا ہے اور ایڑی کی جانب سے زمین تک نہیں پہنچتا۔ چنانچہ اس کو تہبند کے ساتھ ملا دینا یا اس کا حکم اس کے متشدد دینا لوگوں پر بے وجہ مشقت کو مسلط کرنے کے مترادف ہے۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث پر بھی غور فرمایئے:

عن محمد بن ابی یحییٰ حدثنی عکرمة انه رای ابن عباس یاتزر فیضع حاشیة ازراه من مقدمه علی ظهر قدمه و یرفع من مؤخره قلت : لم تأتزر هذه الازرة ؟ قال: رائیت رسول الله ﷺ یاتزر ها ۔(سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار)

ترجمہ: محمد بن ابو یحییٰ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: حضرت عکرمہ نے یہ حدیث مجھے سنائی کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا: تہمد یوں باندھتے ہیں کہ اس کا اگلا حصہ اپنے پاؤں کی پشت پر ڈال دیتے اور اس کا پچھلا حصہ اوپر اٹھا رکھتے، میں نے کہا تہمد آپ یوں کیوں باندھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اکرم ﷺ کو اسی طرح تہمد باندھتے دیکھا ہے۔

تہمد استعمال کرنے والے لوگ خوب واقف ہیں کہ تہمد باندھتے وقت چادر کو پشت سے گھما کر لایا جاتا ہے اور آگے کی جانب چادر کے دونوں سرے ہاتھوں میں لے کر تقریباً ایک چوتھائی حصہ کو مٹھی میں یکجا کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں تہمد کے اگلے سرے باہم ملا کر جب باندھے جاتے ہیں تو نیچے سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ جب کہ ایڑیوں پر تہمد اگلے سروں کے مقابلے میں خاصا نیچے ہوتا ہے۔ اگر اگلا حصہ پاؤں کی پشت پہ ہو تو پچھلا حصہ لازماً ایڑی سے ڈھلک جائے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل جو اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے، اس کے برعکس تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایڑیوں کی جانب سے اوپر رکھتے تھے۔ حدیث شریف میں اس کی حد کے حوالے سے تو کوئی صراحت نہیں ملتی مگر یہ فرق اگر غیر معمولی حد تک ہوتا تو راوی یقیناً اس کا بھی ذکر کر دیتے۔ حدیث شریف کے کلمات پہ غور کیا جائے تو وجہ یہی نظر آتی ہے کہ ایڑیوں کی جانب سے نیچے گرنے سے روکتے اور زمین کے ساتھ لگ کر آلودہ ہونے سے بچاتے تھے۔ اور ٹخنوں کے قریب قریب یا ذرا اوپر رکھتے تھے۔ اور اس عمل کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار گنتی کے ان چند کبار اصحاب رسول علی صاحبھم الصلوٰۃ والسلام میں ہوتا ہے جو محض اہل روایت ہی نہیں، صاحب تفقہ بھی ہیں۔ تفسیر قرآن کے معاملے میں وہ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ سے بڑھ کر منشائے رسالت اور احادیث کے معنی و مفہوم اور مراد و مصداق کا شناسا اور واقف اور کون ہوگا؟ لہٰذا آپ کا یہ عمل محض بیان جواز ہی نہیں بیان علت اور بیان حکمت [illegible] ہے۔

مگر اس حدیث پاک کے فوائد کے ضمن میں علامہ وحید الزمان نے کچھ اور ہی لکھا ہے۔ علامہ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

"پاؤں پر کنارہ آتا یعنی جھکتے وقت رکوع میں نہ کھڑے ہوتے وقت بلکہ کھڑے ہوتے وقت ٹخنوں تک رہتا"

(ملاحظہ فرمایئے! ابوداؤد مترجم، فائدہ نمبر ۲، حدیث مذکورہ بالا)

اگر یہ دعویٰ درست مان لیا جائے تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو چشم دید حالات بیان فرما رہے ہیں، کا یہ سوال محض فضول اور لایعنی نوعیت کا تھا۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل کوئی انوکھی وضع کا تو تھا نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت پر یوں حرف آتا ہے کہ دانا، لایعنی سوالات کے جوابات حکم قرآنی کی رو سے دیا نہیں کرتے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

خذ العفو و أمر بالعرف و اعرض عن الجاهلين ۔(سورہ ۔۷، الاعراف ۔ آیت ۱۹۹)

ترجمہ: درگزر کرتے رہیے، نیکی کا حکم دیتے رہیے، اور جاہلوں سے اعراض ہی فرمایئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو یوں کہنا چاہیے تھا: کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ ایسی کیا انوکھی چیز نظر آ گئی آپ کو؟ اور سوچیے تو یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ یہ نقصان اپنی جگہ، یہی کیا کم ہے حدیث شریف کا معنی و مفہوم بالکل ہی مسخ ہو رہا ہے۔ اردو خواں حضرات کا انحصار تو انہی اردو تراجم پر ہے انہیں کیا پیغام ملے گا اس سے؟

اس حدیث پاک کی روشنی میں تو تہمد کو بھی بصراحت پاؤں کی پشت پر رکھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تو زمرورِ کر اس کا مفہوم بدلنے کے حوالے سے بعض حلقوں میں بے چینی دیکھنے کو ملتی ہے۔ شلوار یا پاجامے یعنی سلے ہوئے، محدود اور سمٹے رہنے والے کپڑوں سے متعلقہ دیگر احکام شرعیہ حضور رسالت مآب ﷺ نے خود بیان فرمائے۔ مگر پاجامے کے پائنچوں کو اونچا رکھنے کا حکم نہیں دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس گواہی سے معاملہ پوری طرح واضح ہو گیا کہ اسبال کا تعلق تکبر سے ہے۔ تکبر نہیں غرض کچھ اور ہے تو اسبال بھی نہیں۔ البتہ اس معاملے میں آپ ﷺ نے خود سکوت ہی اختیار فرمایا۔ تو اس کا شرعی حکم منشائے رسالت کی رو سے بھی یہی ہے کہ شلوار کے پائنچوں کے معاملے میں اسبال کی بات نہ کی جائے۔ بلکہ حلت و اباحت اشیاء کے تناظر میں اسے دیکھا جائے۔ حلت اشیاء کے معاملے میں علامہ شامی تحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المختار ان الاصل الاباحة عند الجمهور۔ (فتاویٰ شامی، جلد اول، کتاب الطہارۃ، مطلب المختار ان الاصل فی الاشیاء الاباحۃ، صفحہ ۷۷، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

ترجمہ: جمہور علماء کا مذہب مختار یہی ہے کہ تمام اشیاء میں حلت واباحت ہی اصل ہے۔

کسی بھی چیز کو ممنوع یا حرام قرار دینے کا حتمی حق صرف اللہ رب ذوالجلال کو ہی حاصل ہے۔ یا حضور رسول اکرم ﷺ ہی شریعت کے ضابطے تشکیل دینے کے مجاز ہیں۔ (سورۃ۔۳۳، الاحزاب، آیت۔۳۶) اور کسی چیز کے حرام ہونے یا حلال ہونے کا فیصلہ اور وضاحت فرما سکتے ہیں۔ (سورۃ۔۷، الاعراف، آیت۔۱۵۷) لہٰذا صحت ایمان کی بنیادی شرط اور تقاضا یہی ہے کہ آپ ﷺ کے احکامات اور فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ اور وہم وگمان کے کسی گوشے میں بھی آپ کے کسی فیصلے کے معاملے میں تردد، تامل یا ملال کی رمق تک نہ بچے۔ (سورۃ۔۴، النساء، آیت ۶۵)

قیاس مع الفارق

اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ شلوار کو تہبند پر قیاس کرتے ہوئے بے وجہ ٹخنوں سے اونچا یا آدھی پنڈلی پر رکھنے کے حکم کے ذیل میں لایا گیا۔ اہل علم قیاس کے قوانین سے بے خبر نہیں کہ جس چیز پر قیاس کیا جاتا ہے، پہلے اس کا حکم اور پھر اس حکم کی علت یعنی سبب اصلی دریافت کیا جاتا ہے۔ مثلاً شراب کا حکم قرآن میں موجود ہے کہ حرام ہے۔ (سورۃ۔۵، المائدہ، آیت ۹۰)

اب حرام قرار دیے جانے کی بنیادی وجہ معلوم کی گئی تو پتہ چلا کہ شراب نشہ آور تھی۔ اس لئے حرام قرار دے دی گئی۔ چنانچہ نشہ آور ہونا اس حکم کی علت قرار پائی۔ اب اگر ہم نے ہیروئن کا حکم شرعی معلوم کرنا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہیروئن بھی اسی قدر نشہ آور بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خطرناک اور مہلک ہے تو دونوں میں علت حکم کی یکسانی کے باعث ہیروئن کا بھی وہی حکم ہوگا جو شراب کا تھا۔ شراب حرام تھی تو از روئے قیاس ہیروئن بھی حرام قرار پائی۔

تہبند کے بارے میں شرعی حکم کی علت تو احادیث کی روشنی میں ہی طے شدہ ہے۔ اور وہ اسبال بغرض تکبر ہے۔ اب شلوار، پاجامے یا پتلون میں دیکھیں اسبال ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! علت حکم یکساں نہ ہو تو ایسی صورت کو اصطلاحاً قیاس مع الفارق، یعنی کسی چیز کو اس سے بالکل مختلف اور جدا چیز پر قیاس کرنا، کہا جاتا ہے۔ قیاس مع الفارق، کوئی نیم خواندہ تو کیا، کسی ناخواندہ شخص کے نزدیک بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ اصحاب فضل وکمال کس بے خیالی میں اس راہ پر آنکلے؟ حکم شرعی کے ثبوت کے لیے دلیل شرعی درکار ہوتی

ہے۔ یہ معاملہ بہت ہی حساس اور ذاتی پسند وناپسند کی حدوں سے بہت بالا وباہر ہے۔ طبیعت کو شریعت کے تابع فرمان اور پابند بنائے رکھنا ہی مسلمانی ہے۔ اگر خدانخواستہ شریعت پر طبیعت حاوی ہوجائے تو بھی کچھ تباہ وبرباد اور نیست ونابود، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(کلیات اقبال، ضرب کلیم، صفحہ ۶۹۱ شیخ غلام علی اینڈ سنز، پاکستان)

ہم ان واعظانہ بحثوں میں نہیں الجھنا نہیں چاہتے جن کی رو سے شریعت اسلام سے قطعی ماوراء ایک چیز ان گنت فضائل اور بے پناہ فیوض وبرکات کے اس مصنوعی باغ کا منظر پیش کرنے لگی جس میں رنگ برنگے میٹھے رسیلے پھل اور خوشنما پھول چاہ میں کشش اور نگاہ میں تازگی پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ اور قریب ہی مہیب شکلوں والے پہریدار لمبی لمبی گرزیں لئے کھڑے ہیں کہ جو ان کی طرف راغب نہیں ہوتا یا انہیں نہ دیکھے اور لوٹے، مار مار کر اس کا حشر کردیں گے یا سڑا ہوا بھس بنا دیں گے۔ یہ شان کسی شکنجے کی ہو تو ہو شریعت کی نہیں ہوسکتی۔ مگر لوگ جسے پسند کرتے ہیں تو خواہ ہوں یا نہ ہوں ساری خوبیاں اسی میں دیکھتے ہیں۔ اس کے عیب اور کمزوریاں انہیں نظر ہی نہیں آتیں۔ اور جب ناپسند کرنے لگ جاتے ہیں تو اس کے ساتھ اس کے بالکل برعکس معاملہ کرتے ہیں کہ ساری خرابیاں اس میں در آتی ہیں، خوبی کوئی نہیں رہتی، یہ دراصل سب طبیعتوں ہی کے طلسماتی گنبد کے ہرے بھرے باغات، آبادیاں اور شہر ہیں۔

فقہاء کی محتاط روش

احکام عملیہ کی شرعی حیثیت کا تعین نہایت اہم، نازک اور حساس مقام ہے۔ فقہائے کرام نے بھی اس نگری میں پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں۔ جن عملی احکام کے بارے میں قرآن مجید میں یا احادیث مبارکہ میں صریح نصوص وارد ہیں، تمام ادلہ کو یکجا کرتے ہوئے اور گہرائی وگیرائی میں اتر کر محتاط ترین فیصلے کیے ہیں۔ اسی محتاط روش کا نتیجہ ہے کہ علامہ شامی کسی چیز کو مطلق مکروہ قرار دیے جانے کی صورت میں ظن وتخمین پہ انحصار کے بجائے دلیل کی جستجو اور اس پہ غور وخوض کا مشورہ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

واذ ذکر وا مکروھا فلا بد من النظر فی دلیلہ فان کان نھیا ظنیا یحکم بکراھۃ التحریم الا لصارف للنھی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نھیا بل کان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفيدا للترك الغير الجازم فهي تنزيهية.

(فتاویٰ شامی، جلد۱، کتاب الطھارۃ، مطلب فی تعریف المکروہ، صفحہ ۷۹، مکتبہ رشیدیہ۔ کوئٹہ)

ترجمہ: فقہاء جب کسی چیز کے مکروہ ہونے کا ذکر کریں تو کراہیت کی دلیل میں غور و خوض ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر نہی (ممانعت کا حکم) حدیث میں وارد ہے، تو کراہیت تحریمی کا حکم لگایا جائے گا۔ مگر جب کوئی اور دلیل تحریم سے استحباب کی طرف حکم کو پھیر دے۔ اور اگر دلیل بصیغہ نہی نہیں، غیر قطعی طریقے پر صرف ترک فعل کی ترغیب کا حکم معلوم ہوتا ہے تو یہ تنزیہی ہے۔ بجز اس کے کہ صحیح شرعی حکم کا تعین ممکن ہے نہ مناسب۔ علامہ شامی ہی کے طرز استدلال میں اس جزئیے کی جھلک ملاحظہ کیجئے۔ کھڑے کھڑے پانی پینے کا مسئلہ ہے۔ منصوص علیہ بھی ہے۔ لیکن نصوص احادیث میں تعارض ہے۔ ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ لا يشرب احد منكم قائما فمن نسي فليستقيء. (صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب الاشربہ، باب فی الشرب قائما، صفحہ ۱۷۳، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی کھڑے کھڑے ہرگز پانی نہ پئے۔ اور اگر کوئی بھول جائے تو قے کر دے۔

دوسری حدیث میں نزال بن سبرہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کوفہ کی مسجد میں وضو فرمایا پھر: قام فشرب فضله و هو قائم ثم قال ان ناسا يكرهون الشرب قائما وان النبي ﷺ صنع مثل ما صنعت. (صحیح بخاری، کتاب الاشربہ، باب الشرب قائما)

ترجمہ: کھڑے ہوئے اور کھڑے کھڑے وضو سے بچا ہوا پانی پیا پھر فرمایا: کچھ لوگ کھڑے کھڑے پانی پینے کو مکروہ سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے یہ عمل کیا تھا جو میں نے کیا ہے۔

علامہ نووی نے مذکورۃ الصدر حدیث کی شرح کرتے ہوئے دانستہ یا بھول کر کھڑے کھڑے پانی پی لینے والے کے لئے قے کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے:

والصواب فيها ان النهي فيها محمول على كراهة التنزيه واما شربه ﷺ قائما فبيان للجواز. (علامہ نووی، شرح حدیث مذکورۃ الصدر)

ترجمہ: اس معاملے میں حق بات یہ ہے کہ ممانعت کراہیت تنزیہی پر محمول ہے۔ رہا معاملہ آپ ﷺ کے کھڑے ہو کر پانی پینے کا تو آپ ﷺ کا یہ عمل بیان جواز کے لیے تھا۔

یہاں یہ نتیجہ تو بدیہی ہے کہ مکروہ تنزیہی کی حیثیت "نامناسب" سے زیادہ نہیں۔ ورنہ وہی عمل جائز ہرگز نہ ہو سکتا۔ علامہ شامی نے شمنی کے حوالے سے ایک اور روایت بھی بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: "کھڑے کھڑے پانی پینے کو صرف اس لئے مکروہ قرار دیا گیا ہے کہ یہ عمل تکلیف دہ ہے"۔ پھر حلیہ کے حوالے سے نہایت جامع اور محتاط موقف بیان فرمایا ہے:

فالكراهة على ما صوّبه النووي شرعية يثاب على تركها وعلى هذا ارشادية لا يثاب على تركها. (فتاویٰ شامی، جلد۱، مطلب فی مباحث الشرب قائما، صفحہ ۹۶، مکتبہ رشیدیہ۔ کوئٹہ)

ترجمہ: تو نووی نے جسے حق بات قرار دیا ہے اسے دیکھا جائے تو یہ "کراہت شرعی" ہوگی، اس سے بچنے والے کو ثواب ملے گا۔ اور اس قول کی روشنی میں یہ "کراہت ارشادی" (نامناسب عمل) ہوگی۔ اس سے بچنے پر ثواب نہیں ملے گا۔

ایک ایسا عمل جس کی بہت تاکید کے ساتھ حدیث صحیح میں بصیغۂ نہی ممانعت موجود ہے۔ حتیٰ کہ بھول کر ایسا کر لینے والے کو قے کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ تفصیلی چھان بین کے بعد نامناسب عمل سے زیادہ نہ نکلا۔ پھر کس برتے پہ خالص رخصت کو مطلقاً مکروہ اور پھر اس مکروہ کو مکروہ تحریمی قرار دیا گیا ہے؟

دین میں آسانی

حضور رسالت مآب ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا کہ لوگ اسلامی تعلیمات میں بے اعتدالیوں کے نتیجے میں کہیں اکتا نہ جائیں۔ اور بیزار ہو کر بدعملی یا بے عملی کی طرف راغب نہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے نماز لمبی کرنے پر امام کی سرزنش فرمادی تھی۔ اور اس عمل کو بھی دین سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے کے مترادف قرار دیا تھا۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کی روایت کردہ حدیث پاک کے کلمات پر غور فرمایئے ارادی: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اتى رجل النبي ﷺ فقال: اني لأتأخر عن صلوٰة الغداة من اجل فلان مما يطيل بنا، قال فما رائيت رسول الله ﷺ قط اشد غضبا في موعظة منه يومئذ، قال: فقال: يايها الناس ان منكم منفرين، فايكم ما صلى بالناس فليتجوز فان فيهم المريض والكبير و ذا الحاجة. (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یجوز من الغضب والشدۃ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وایضا کتاب الاذان، باب من شکی امامہ)

ترجمہ: ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں صبح کی نماز میں فلاں صاحب کی وجہ سے شرکت نہیں کرتا کہ لمبی لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں: میں نے رسول اکرم ﷺ کو کبھی کسی وعظ میں اتنا غصے میں نہیں دیکھا جتنا کہ اس روز دیکھا۔ فرماتے ہیں: پھر آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لوگوں کو دین سے دور کر رہے ہیں۔ تو تم میں سے جب کوئی نماز پڑھائے تو نماز کو طول دینے سے گریز کرے۔ اس لئے کہ ان میں بیمار بھی ہوتے ہیں، بوڑھے بھی اور کام کاج والے بھی۔

نماز کو طول دینا اگر نگاہ رسالت میں لوگوں کو دین سے دور کرنے کی کوشش اور بددل و بیزار کرنے کے مترادف عمل ہے تو باقی معاملات میں بے اعتدالیوں کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

آپ ﷺ نے ہمیشہ امت کی آسانی اور سہولت ہی کو مد نظر رکھا۔ آپ ﷺ نے یہی اسوہ چھوڑا اور اسی کی تلقین بھی فرمائی۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہی کی روایت کردہ اس حدیث پاک پر بھی ذرا غور کیجئے:

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی ﷺ قال: یسروا و لا تعسروا و بشروا و لا تنفروا۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولهم با لموعظة والعلم کی لا ینفروا)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: آسانیاں ہی پیدا کرو، دشواریاں پیدا مت کرو اور لوگوں کو خوشیاں ہی بانٹو، انہیں دین سے متنفر مت کرو۔

رسول کریم ﷺ کے اس حکم کے معاملے میں ہمارا رویہ اور طرز عمل کس قدر معاندانہ ہے؟ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے جو جو آسانیاں اور سہولتیں اس امت کو دیں، اپنوں نے ہی چھین لیں۔ لوگوں کی آج دین کے معاملے میں بیگانگی زدہ بیزاری تکلیف دہ ہی سہی، اس کے محرکات و عوامل اور بھی ہو سکتے ہیں، مگر سب سے بڑا محرک ہماری نظر میں یہ ہے کہ جو پیغام ان تک پہنچا کافی حد تک مسخ شدہ حالت میں تھا۔ لہٰذا اپنوں کو اپنی خبر گیری کی راہ بھی نکالنی چاہیے۔ کہ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست (اے بادِ صبا یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے)

قرآنی تعلیمات و احکامات ان بے اعتدالیوں کے حوالے سے اور بھی واضح ہیں۔ اللہ رب

ذوالجلال نے شریعت سازی کی بے کار مشق اور اللہ اور اس کے رسول کے احکامات سے بڑھ کر کچھ کرنے کے عمل کو نبی کی نوک پر رکھا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

یایها الذین امنوا لا تقدموا بین یدی الله ورسوله واتقوا الله ط ان الله سمیع علیم۔

(سورہ ۴۹، الحجرات، پہلی آیت مبارکہ)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت نکلو اور ڈرو اللہ سے، قول فیصل ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سننے والا، بہت جاننے والا ہے۔

معروف مترجم اور مفسر قرآن علامہ محمد جونا گڑھی نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: اس کا مطلب ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرو۔ نہ اپنی سمجھ اور رائے کو ترجیح دو بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اپنی طرف سے دین میں اضافہ یا بدعات کی ایجاد اللہ اور رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی ناپاک جسارت ہے۔ جو کسی بھی صاحب ایمان کے لائق نہیں۔ اسی طرح کوئی فتویٰ قرآن و حدیث میں غور و فکر کے بغیر نہ دیا جائے اور دینے کے بعد اگر اس کا نص شرعی کے خلاف ہونا واضح ہو جائے تو اس پر اصرار بھی اس آیت میں دیئے گئے حکم کے منافی ہے۔ مومن کی شان تو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کے سامنے سر تسلیم و اطاعت خم کر دینا ہے۔ نہ کہ ان کے مقابلے میں اپنی بات پر یا کسی امام کی رائے پر اڑے رہنا۔ (اردو ترجمہ و تفسیر از علامہ محمد جونا گڑھی)

ضیاء الامت حضرت پیر کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں: حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے رب کریم اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے ارشاد کے علی الرّغم (برعکس) کوئی بات کہے یا کوئی کام کرے۔ جب انسان اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے تو وہ اس امر کا بھی اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ آج کے بعد اس کی خواہش، اس کی مرضی، اس کی مصلحت خدا اور اس کے رسول کے حکم پر بلا تامل قربان کر دی جائے گی۔ (ضیاء القرآن)

ان طویل تفسیری اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد ہم اس معاملے میں مزید کسی تبصرے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

اسلامی اقدار اور روایات

انسانی لباس کے معاملے میں اسلامی تعلیمات نہایت حکیمانہ اور متوازن ہیں۔ افراط و تفریط سے بالکل خالی۔ شریعت اسلامی کے رہنما اصولوں سے یہ واضح ہے یا پہلو تہی کہ کئی چیزیں اسلام کی روح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار دے دی گئی ہیں۔ کئی ایک کو بے تامل غیر اسلامی قرار دے دیا گیا ہے۔ اسی طرح بہت سی صورتیں جو بیان جواز کی تھیں، اولین ترجیح بن گئی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ رب ذوالجلال نے لباس کو اپنی نعمتوں میں شمار کیا ہے اور اسے اپنی آیت (نشانی) قرار دیا ہے:

• یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواٰتکم وریشا ط ولباس التقوی ذالک خیر ط ذالک من آیات اللہ لعلھم یذکرون۔ (سورہ ۷، الاعراف، آیت ۲۶)

ترجمہ: اے اولادِ آدم ہم نے ہی تمھیں یہ لباس مہیا کیا ہے، جو ستر پوشی کے لئے تمہارے کام آتا ہے اور تمہارے لئے زیب و زینت کا بھی ذریعہ ہے اور پرہیزگاری کی دائمی مصاحبت و لحاظ نہایت ہی اچھا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تا کہ لوگ یاد رکھیں۔

آیت مبارکہ میں لباس کو عطیہ خداوندی قرار دیتے ہوئے اس کی دو نمایاں خصوصیات پر خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔ "ستر پوشی" اور "زیب و زینت"۔ واو عطف کی مغایرت گواہ ہے کہ لباس کو صرف ستر پوشی تک محدود کر دیے جانے کی قرآنی احکامات کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ زینت بھی لباس کا ایک اہم مقصد ہے۔ اور اس سے گریز خودساختہ محرومی۔ تاہم آیت مبارکہ میں ایک حساس نکتہ بھی ہے۔ اور وہ ہے۔ "لباس التقویٰ" یعنی تقویٰ کا لباس۔ جس طرح حدیث کے اندر کی جانے والی معمولی تبدیلی نے پورے نظریے اور فکر و فلسفہ کا رخ موڑ دیا تھا، بالکل اسی طرح یہاں بھی ذرا سی غلطی پورے نظریے کو متاثر کر دے گی۔ امام المفسرین فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ نے لباس التقویٰ کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ فرماتے ہیں: قتادہ، سدی اور ابن جریج کا خیال ہے کہ اس سے مراد "ایمان" ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک اس سے مراد "اچھے اعمال" ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد زرہ بکتر ہے۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ کپڑے مراد ہیں جو نماز کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ پھر آخر میں ابوعلی فارسی کا قول نقل فرماتے ہیں:

(ولباس التقویٰ خیر) لصاحبہ اذا اخذبہ واقرب لہ الی اللہ تعالیٰ مما خلق من اللباس والریاش الذی یتجمل بہ۔ واضیف اللباس الی التقوی کما اضیف الی الجوع فی قولہ تعالیٰ: "فاذا قھا اللہ لباس الجوع والخوف"۔

ترجمہ: تقویٰ کا لباس صاحب تقویٰ کے لئے نہایت ہی اچھا ہے۔ خصوصاً جب وہ اس سے استفادہ کرے اور لباس اور زینت کی اشیاء، جن سے خوبصورتی اور زیبائش حاصل کی جاتی ہے، کے تناظر میں اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرے۔ اور یہاں لباس کی اضافت تقویٰ کی طرف ایسی ہی ہے جیسے فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف (سورہ ۱۶، النحل، آیت ۱۱۲) تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا) میں لباس کی اضافت بھوک کی طرف ہے۔

ان تمام اقوال کی روشنی میں صحیح تر بات یہ ہے کہ یہاں لباس کا لغوی یا عرفی معنی مراد ہی نہیں۔ بلکہ لازمی معنی مراد ہے۔ یعنی "کل وقتی مصاحبت سے استفادہ اور اسکا لحاظ اپنے اوپر طاری کئے رہنا" اور یہ سیرت و کردار کی پختگی اور عمل میں مواظبت سے کنایہ ہے۔ گویا تقویٰ و پرہیزگاری کی دائمی مصاحبت اور استحکام نہایت ہی اچھا ہے۔ اس سے لباس کی کسی خاص ہیئت یا وضع پر استدلال کسی بھی طرح درست نہیں۔ ورنہ بھوک کی بھی ہیئت اور شکل کا تعین ضروری ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ محسوسات کا معاملہ ہے۔ یہ کہنا بھی فضول سی بات ہوگی کہ بھوک کا لباس ہی کر پہنا دیا گیا ہوگا۔ وہاں بھی دائمی بھوک اور افلاس کے مسلط کر دیے جانے سے کنایہ ہے۔ جو زوال نعمت کے بعد نہایت کربناک چیز ہے۔ اسی طرح آیت کے اس حصے سے تصنع (بناوٹ) تقشف (پھٹا پرانا لباس اور بدحالی) اور تکلف پر استدلال بھی غلط اور نامناسب ہوگا۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ لباس کے ذکر کے ضمن میں اسے لانے کی حاجت کیا تھی؟ آخر اس ضابطے کی مذکورۃ الصدر ضابطے کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ آدمی جن مصارف پر اپنا مال و دولت اور سرمایہ فراخدلی سے خرچ کر سکتا ہے، ان میں سب سے نمایاں لباس ہے۔ ایک عام تاثر جو اس معاملے میں لوگوں پر طاری ہے یہ بھی ہے کہ "یہ تو کوئی نہیں دیکھتا کہ کھایا کیا ہے، لباس سب دیکھتے ہیں"۔ اسلام چونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال کا داعی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں چاہتا کہ لوگ فاقے دیکھیں اور مہنگی سے مہنگی پوشاکیں خرید خرید کر زیب تن کرتے رہیں۔ حد اعتدال سے نہ تو پیچھے ہٹنے کی اجازت ہے اور نہ آگے بڑھنے کی۔ گویا نہ تو بخل کی اجازت ہے کہ کوئی عند الضرورت بھی خرچ نہ کرے اور نہ ہی فضول خرچی کو پسندیدہ یا لائق ستائش گردانا گیا ہے۔ سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے دیگر اقوام عالم کے سامنے اپنے پاکیزہ صفت بندوں کو "عباد الرحمٰن" کہہ کر فخریہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور ان کی متعدد خوبیوں کو بطور خاص نشان زد کیا ہے۔ ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے:

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما۔ (سورہ ۲۵، الفرقان، آیت ۶۷)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو خرچ کرتے وقت فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ دونوں کے بیچ اعتدال پر ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے اس حوالے سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک سنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق قول بھی نقل کیا ہے۔ بیٹی کی شادی کے موقع پر عبدالملک بن مروان نے آپ سے اخراجات کی بابت پوچھا۔ تو آپ نے جواب دیا تھا "نیکی دو بدیوں کے درمیان ہے" اس سے آپ کا اشارہ فضول خرچی اور بخل کے درمیان حد اعتدال کی جانب تھا۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اگر جز وقتی ہے تو بھی نیکی ہے۔ مگر کل وقتی عمل ہے تو اس کی شان ہی اور ہے۔ اور لباس التقویٰ کا مصداق بھی یہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تقشف کے سرے بخل سے ملتے ہیں خصوصاً گنجائش ہوتے ہوئے ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی عمل ہے۔

دامان توکل کی یہ خوبی ہے کہ اس میں
پیوند تو ہو سکتے ہیں دھبے نہیں ہوتے

امام محمد بن اسماعیل بخاری نے کتاب اللباس کے شروع میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

كل ما شئت والبس ما شئت ما اخطأ تك اثنتان سرف ومخيلة (صحیح بخاری، تمہید کتاب اللباس)

ترجمہ: جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو جب تک کہ تمہیں دو چیزیں خطا کار نہ بنا دیں: فضول خرچی اور تکبر

علامہ جار اللہ زمخشری نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسے ابن ابی شیبہ کی روایت قرار دیا ہے۔ اور ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ نسائی، ابن ماجہ، احمد اور حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ (دیکھئے: الکافی بذیل الکشاف، تفسیر آیت: ۳۱، سورہ ۷۔ الاعراف)

اسی طرح فضول خرچی سے گریز پا رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے استفادے کا حکم بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ لباس ہی کے معاملے میں ارشاد ربانی ہے:

خذوا زينتكم عند كل مسجد وكلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا يحب المسرفين -

(سورہ ۷، الاعراف، آیت ۳۱)

ترجمہ: ہر نماز کے وقت اپنی زینت کا خیال رکھا کرو! اور کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو! طے شدہ بات ہے کہ وہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

علامہ جار اللہ زمخشری نے اس آیت کی روشنی میں نماز کے لئے اپنا حلیہ درست کر کے نکلنا مستحسن قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

والسنة ان يأ خذ الرجل احسن هيئته للصلوة-

ترجمہ: مستحسن طریقہ یہ ہے کہ آدمی نماز کے لئے اپنی ہیئت کو خوب تر بنانے کا خیال رکھے۔

یہاں نماز کی تخصیص اس لئے ہے کہ عہد جاہلیت میں لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ لباس ہمارے گناہوں میں تھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے سمیت اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری و حضوری شرمناک عمل ہے۔ لہٰذا اسی حالت میں طواف ضروری ہے جس حالت میں ماں نے انہیں جنم دیا تھا۔ اس آیت میں ان کے اس نظریہ کا رد مقصود تھا۔ ورنہ لباس اور زیب و زینت کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا تعلق انسان کی عمومی زندگی سے بھی اتنا ہی ہے، جتنا کہ حالت نماز یا طواف کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ خود بھی جمال کو پسند فرماتا ہے۔ انسان کو بھی اس نے خوبصورت ترین شکل وصورت پر پیدا کیا ہے۔ (سورہ ۹۵۔ التین، آیت ۴) اس کی جلد کی ساخت کو نہایت پرکشش اور اعضاء کو متوازن اور مناسب رکھا ہے۔ بے پناہ حسن وجمال سے اسے نوازا اور پھر اسے اپنی صنعت وکاری گری کا بے مثال شاہکار بنا دیا۔ انسان سے تو اس شاہکار کی لاج بھی نہ رہ پائی۔

ہر دور میں اور ہر معاشرے میں کچھ دانا اور پختہ کار لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک معاشرتی بھرم اور وقار ہوتا ہے۔ ان کی اپنی ایک وضع قطع ہوتی ہے۔ جو کسی اونچ نیچ کی انہیں اجازت ہی نہیں دیتی۔ سب کی نگاہوں میں محترم ومقتدر۔ اگر کسی روز اس طبقے کی پہچان "تھری پیس" بن جائے تو یہ بھی خالص اسلامی لباس شمار ہوگا۔ ہر معاملے میں لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دینے کا شوق شریعت کا نہیں کسی اور کا ہو تو ہو۔ جاہلیت قبل از اسلام نے نیکی اور تقویٰ کے نام پر لوگوں کے لباس اتروا دیے تھے۔ آج بھی اسی آڑ میں انسان کو بے رنگ و نور بنایا جا رہا ہے۔ اس سے اس کا بھرم اور وقار چھین کر بدنمائی کا نمونہ بنایا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم ﷺ سے فرمایا تھا کہ ان لوگوں سے پوچھیے! وہ کونسی "مجاز اتھارٹی" ہے؟ جس نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور لوگوں کے عام استفادے اور زیب وزینت کے لئے رکھی گئی اشیاء کو "حرام" قرار دے ڈالا۔ ارشاد ربانی ہے:

قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبت من الرزق ط قل هى للذين امنوا فى الحيوة الدنيا خالصة يوم القيامة ط كذالك نفصل الايت لقوم يعلمون-

(سورہ ۷، الاعراف، آیت ۳۲)

ترجمہ: (اے حبیب مکرم!) ذرا ان سے پوچھیے تو وہ کون ہے؟ جس نے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لئے بنائے ہوئے اسباب زینت اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دے ڈالا ہے؟ آپ فرمادیجئے! ایسا کل سرمایہ تو اہل ایمان کا ہی ہے، جو قیامت کے روز خالص انہی کا ہوگا، اسی طرح آیات کو ہم سمجھداروں کے لئے فیصلہ کن بنادیا کرتے ہیں۔

ذرا یہ تو سوچیے! کس نے کس کو کیا پوچھنے کا حکم دیا تھا؟ یہ سوال کل بھی اہم تھا آج بھی ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔

عرفی تغیرات

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہر قوم اور معاشرے کو مسلسل تغیرات کا سامنا رہتا ہے۔ رہن سہن کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی لوگوں کے افکار وخیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ آج جو چیز لوگوں کی محکم عادت ہے یا زبان سے نہیں اترتی، ممکن ہے نئے زمانے کے رجحانات اس کا پوری طرح صفایا کردیں۔ ماضی کے کئی اہم تصورات آج فقط کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔ ایسی قدریں معاشرے میں تعارف اور مسابقت کے زور پر پھلتی پھولتی ہیں۔ اور ان سے محرومی انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ مساجد کے معاملے میں عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے رجحانات کیا تھے؟ اور زمانہ مابعد میں کتنی تبدیلیاں واقع ہوئیں؟ قرون وسطی کے بعض ادوار میں تو توہمات کے نرغے میں نظر آتی ہیں۔ امام و موذن کے اجرت لینے کے معاملے میں متقدم فقہائے کرام کے فتاویٰ کیا تھے؟ اور متاخرین نے کیا فتویٰ دیا؟ اور نئے فتویٰ کی بنیادیں کن اصولوں پر استوار تھیں؟ سب جانتے ہیں دونوں کے عہد کے عرف باہم متغایر تھے۔ اور یہی چیز ایک "حرام" کو "حلال" قرار دیے جانے کی وجہ بنی۔ پھر کرم خوردہ کتابوں سے عہد ماضی کے تصورات کہنہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے لوگوں کو جو اس بھولی بسری روایت کے عادی ہیں نہ شناسا، معتوب اور مطعون کرنا کہاں کی دانائی ہے؟ معروف اصولی محمد زکریا بردیسی، عرفی تغیرات کے باعث احکام شرعیہ پر مرتب ہونے والے اثرات کی متعدد مثالوں سے توضیح فرمانے کے بعد آخر میں عرف کی اہمیت اور شرعی حیثیت کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

ومما تقدم جميعه يظهر بو ضوح ان العرف مصدر خصيب فى التشريع والفتوى والقضاء وهو كما يجب مراعاته فى تشريع الاحكام وابتنا ئها عليه يجب ان يراعى فى تفسير النصوص فيخصص العرف الصحيح العام و يقيد المطلق ويترك به القياس ۔ (بردیسی، اصول الفقہ، الدلیل السابع العرف، صفحہ ۳۳۷، دار الثقافۃ للنشر و

التوزیع۔ قاہرہ ۱۹۸۵ء)

ترجمہ: جو کچھ اوپر بیان ہوا، ان ساری چیزوں کے پیش نظر پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات منظر عام پر آجاتی ہے کہ قوانین شرعیہ، فتویٰ اور عدالتی احکامات کے معاملے میں عرف ایک نہایت ہی زرخیز مصدر و ماخذ ہے۔ اور جس طرح عملی احکام کی شرعی حیثیت کے تعین اور اس کو ان کے لئے بنیاد بنانے کا لحاظ ضروری ہے، اسی طرح یہ امر ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ نصوص شرعیہ کی تفسیر کے دوران عرف صحیح، عام میں تخصیص پیدا کردیتا ہے۔ مطلق کو مقید کرسکتا ہے اور اسکے پیش نظر قیاس کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

عہد جاہلیت کے اس متکبرانہ اسبال کے تو مدفن بھی اپنے نشانات کھو چکے ہیں۔ اب گڑھے مردے اکھاڑنے اور لکیر پیٹنے سے فائدہ؟ یہ قدغن تکبر پہ لگائی گئی تھی اس کے مظاہر آج اور ہیں اور کئی ہیں یہ حکم اب ادھر منتقل ہو جائے گا۔ تکبر اور اس کے مظاہر کے تعاقب پر قدغن لگانے میں تو کسی کو کلام نہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عہد رسالت میں یہ حکم عام کیوں تھا؟ تمام صحابہ کرام پابند تھے ان میں کئی تو ایسی ہستیاں بھی شامل تھیں جو تکبر کی راہ سے کبھی گزری تک نہیں تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے؟ کہ یکساں طور پر سب پر یہ حکم نافذ کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکم کا تعلق لباس اور انسان کی ظاہری وضع قطع سے تھا۔ اسبال کرنے والے بھی بہت تھے۔ اور پورے عرب میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے ان تک موثر پیغام رسانی کے لئے یہ یکسانی حکیمانہ اور ناگزیر تھی۔ اس کے باوجود احادیث میں جابجا ذکر ملتا ہے کہ کئی ایک تک، رابطے فقدان کے باعث ہی شاید، عہد رسالت کے بھی بہت بعد، یہ پیغام پہنچ سکا تھا۔

احادیث مبارکہ کے بغور مطالعہ سے مسئلے کی نوعیت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ اس حکم کا مقصد تکبر کی اس علامت کی بیخ کنی تھا جو غیر حقیقت پسندانہ رویوں اور طرز عمل پر مبنی تھی۔ اور مسلمانوں کو ناز و نعم کا رسیا و دلدادہ بننے سے روکنا تھا۔ آج شہری طبقے میں تہمد کا رواج ہی نہیں رہا۔ اور دیہات میں بعض جگہ اگر اس کا رواج ہے بھی تو نتیجۂ غربت و افلاس نے لوگوں کو اس نوع کی چونچلے بازی کے لائق ہی نہیں چھوڑا۔ لہٰذا بلا ارادہ تکبر اگر ان کے تہمد بھی ٹخنوں کو چھپا لیں تو ان سے صرف نظر ہی بہتر ہے۔ افضل یا اولیٰ کے خلاف عمل زیادہ سے زیادہ نامناسب کی حد تک جاسکتا ہے اور لائق سرزنش وعتاب تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس کے مقابلے میں ایک اچھے بھلے انسان کو بدوضع اور بدہیئت بنانا یا پنڈلیوں کی سرعام نمائش کرنا زیادہ نامناسب اور تہذیب و شائستگی کے منافی عمل ہے عام معروف قاعدہ ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین نیکوکاروں کی نیکیاں، مقربین کی حدود میں گناہ شمار ہوتی ہیں۔ اگر کوئی عوام کو مقربین کے درجہ پر فائز کرنے پر ہی ادھار کھائے بیٹھا ہے تو مرض لاعلاج ہے۔ عوام کو عوام ہی کی سطح پر رکھا جائے۔ افراط و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفریط سے گریز کیا جائے۔اور احادیث میں وارد وعیدیں (عذاب اور جہنم کی دھمکیاں) پڑھ پڑھ کر انہیں خوفزدہ نہ کیا جائے اور دین وشریعت کو خوفناک شکل میں ان کے سامنے پیش نہ کیا جائے حقیقت یہی ہے کہ ٹخنوں پہ پائینچے رکھنے کے معاملے میں لوگ نہ تو گناہگار ہیں اور نہ ہی جہنمی۔اس مسئلے میں علامہ ملا علی قاری کی رائے ماہرانہ، دانشمندانہ اور معتدل ومتوازن ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے ہر ہر پہلو کو جس طرح کھنگالنے اور کریدنے کی کوشش کی گئی ہے، آپ کے سامنے۔ہم سطور بالا میں یہ بھی کہہ آئے ہیں کہ یہ عمل ہمارے کسی بھی مکتبہ فکر کی امتیازی علامت یا شعار نہیں۔مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے اسے اسلامی فکر کا آئینہ دار سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔اور کچھ لوگوں نے خواہ مخواہ اس کی وکالت کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔یہ سب کچھ محض غلط فہمی اور نادانی کے باعث ممکن ہوا۔کوئی بھی صاحب فہم ودانش شخص فکر اسلامی میں اس نوع کی آمیزش اور غلط فہمی کے تسلسل کی حمایت نہیں کر سکتا۔حق واضح ہو جائے تو اسے قبول کرنا ہی حقیقت پسندی اور حق پرستی ہے۔مقصود اگر تکبر کا خاتمہ ہی ہے تو زیر نظر مضمون میں پیش کردہ اولین حدیث پاک کی روشنی میں حق کو قبول نہ کرنا بھی تکبر ہی کی ایک شکل ہے بلکہ قبول حق سے گریز اور انکار تکبر کی بدترین صورت ہے۔لہٰذا اب بھی اصلاح ممکن نہ ہو سکی تو اصحاب علم ودانش اور ارباب فضل وکمال کے سامنے یہ تلخ حقیقت سوالیہ نشان بن کر ابھرے گی کہ کم ترین تکبر کے خاتمہ کی آڑ لے کر بدترین تکبر کا ارتکاب آیا جائز اور درست ہوگا؟ فرمان رسالت مآب ﷺ پر ایک بار پھر غور فرمایئے! امام ابو عیسیٰ ترمذی کی روایت ہے:

ان اللہ یحب الجمال ولکن الکبر من بطر الحق و غمص الناس۔(جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی الکبر)

ترجمہ: طے شدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔لیکن تکبر یہ ہے کہ کوئی حق کے مقابلے پر اڑا رہے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

خلاصہ بحث

۱۔شلوار، پاجامے یا پتلون کے پائینچے کے معاملے میں شریعت اسلامی نے رخصت دے رکھی ہے۔کوئی اور قوت اس امر کی ہرگز مجاز نہیں کہ شریعت کی عطا کردہ رخصت کو باطل کرتے ہوئے نئی وضع کے احکامات جاری یا نافذ کر سکے۔

۲۔شلوار، پاجامہ اور پتلون ایک ہی وضع کے لباس ہیں، لہٰذا ان سب کا حکم ایک ہی ہوگا کہ حالت نماز میں

ہوں یا غیر نماز میں پائینچہ وہاں رکھا جائے جہاں لطافت پسند طبیعتیں گوارا کریں۔اور انسان بدہیئت اور بد وضع بھی نظر نہ آئے۔

۳۔حالت نماز میں پائینچے سے ٹخنے ڈھکے رہنے کی صورت میں نماز کی صحت اور درستگی پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔نماز کے "واجب الاعادہ" ہونے کا قول محض بے اعتدالی ہے۔کسی ذاتی ضرورت یا مصلحت کے تحت شلوار کو آدھی پنڈلی پر یا ٹخنے سے اوپر رکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ شریعت لوگوں کے روزمرہ میں نہیں الجھتی۔تاہم اسے شرعی ضروریات یا نیک عمل سمجھ کر اہتمام کے ساتھ کرنا دیدہ دلیری کے ساتھ عطیہ رسول کی ناقدری ہے۔

۴۔مساجد میں نماز سے قبل پائینچے اونچا رکھنے کے حوالے سے تبلیغ واصرار عین نماز سے پہلے ایک غیر شرعی امر کی تبلیغ ہے اور وہ بھی خانہ خدا میں اس سے بچنا ضروری ہے۔

۵۔تہہ استعمال کرنے والے افراد حالت نماز میں ہوں یا غیر نماز میں تہہ کو اگر بغرض تکبر ٹخنوں پر یا ان سے بھی نیچا رکھیں گے تو مکروہ تحریمی کا ارتکاب ہوگا۔اس صورت میں ادا شدہ نماز یقیناً واجب الاعادہ ہوگی اور اگر تکبر کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی اس نمازی کے عہد کے لوگ اس عمل کو تکبر کی علامت خیال کرتے ہوں تو نہ تو وہ گناہگار کہلائے گا، نہ اس حالت میں ادا شدہ نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

واللہ تعالیٰ اعلم وھو الموفق للصواب

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف!
تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصوف کی رو سے فقیر اور فقیری کا مفہوم

لیفٹننٹ کرنل محمد اعظم

لفظ "فقر" سے فقیر اور فقراء کے صیغے متعدد مرتبہ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ لفظ فقر کا معنی تنگی، مفلسی، مفلوک الحالی اور غربت کے لیے جاتے ہیں، اسطرح معروف معنی میں ہر غریب محتاج و مفلس شخص کو ہی فقیر کہا جاتا ہے یعنی جس کے پاس اسباب دنیا میں کچھ نہ ہو وہی فقیر ہے، قرآن مجید میں بھی ایک جگہ غنی کے مقابل لفظ فقیر استعمال ہوا ہے جیسے فقیر و نحن اغنیاء (۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مالدار ہے وہ غنی کہلاتا ہے اور جو غریب ہے وہ فقیر کہلاتا ہے یعنی فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو جب کہ علمائے فقہ نے مصارف زکوٰۃ میں جہاں فقراء مساکین، غارمین وغیرہ کی تعریف کی ہے وہاں فرماتے ہیں کہ جس کے پاس ایک وقت (موجود) کے کھانے کے بقدر بقائے زیست ہو لیکن دوسرے وقت کے لئے کچھ بھی نہ ہو وہ فقیر ہے۔ (۲)

سی طرح فقیر کی جمع فقراء متعدد مرتبہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو تنگدست، مفلس، غریب ہیں اور جو زکوٰۃ، خیرات، صدقات وغیرہ کے مستحق ہیں یعنی متاع دنیا میں سے جنکے پاس کچھ نہ ہو وہی فقراء ہیں۔ شاید اسی معنی و مراد کے پیش نظر بعض متقدمین اور متاخرین فقہا کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سید الفقراء والفقراء والمساکین کہنے سے بوجہ اکرام و احترام منع فرمایا ہے۔ کیونکہ فی زمانہ فقیر کا لفظ گداگر کے لئے بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

نیز ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ میدان حشر میں فقیر وہ ہوگا جس نے دنیا میں تو بہت نیکیاں کی ہوں گی مگر بوقت حساب و کتاب وہ سب نیکیاں حقوق العباد کے عوض دے بیٹھے گا اور اس کے پاس کچھ بھی عمل خیر باقی نہیں بچے گا۔ یعنی وہ پہلے تو نیکیوں کے انبار کا مالک تھا پھر مفلس ہو گیا تو ایسے مفلس کو فقیر کہا گیا ہے۔ نیز علمائے لغت نے بھی فقیر کی یہی تعریف کی ہے کہ جو پہلے مالدار ہو پھر کسی سبب سے

اس کے پاس کچھ نہ رہا ہو تو وہ فقیر ہے یعنی تہی دست ہو جانے والے کو فقیر کہا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے جسے صوفیاء کرام اکثر بطور حوالہ پیش کرتے ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا الفقر فخری یعنی فقر میرا فخر ہے تو یہاں فقر سے مراد معروف معنی تنگی، مفلسی، محتاجی وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہاں فقر کا معنی تہی دست یعنی خالی ہاتھ ہو جانا ہی مراد ہوگا اس لیئے کہ حضور اکرم کے اوصاف حمیدہ میں سے ایک وصف محمودہ یہ بھی ہے کہ آپ کے پاس غنائم، ہدایا اور فتوح وغیرہ کی صورت میں جتنا بھی مال آتا وہ شام تک تقسیم کر دیا جاتا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ فقر یعنی خالی ہاتھ ہو جانا ہی میرے لیے فخر ہے۔ اس پر شاہد آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر احد پہاڑ میرے لیے سونے کا ہو جائے تو واللہ میں اس وقت تک گھر میں داخل نہیں ہونگا جب تک اسے تقسیم نہ کر دوں۔ ان توضیحات میں سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم ﷺ نہ معروف معنی میں تنگدست تھے اور نہ ہی غریب و نادار تھے۔ دوم یہ واضح ہو گیا کہ حدیث و فقہ کی اصطلاحی تعریف میں فقیر اسے کہتے ہیں جس کے پاس ایک وقت میں سب کچھ ہو اور دوسرے وقت میں کچھ نہ ہو۔

لفظ فقیر تصوف میں کب سے اور کیسے داخل ہوا یہ تو واضح نہیں ہے لیکن فارسی لفظ پیر جس طرح صوفیاء کے لیئے مستعمل ہوا اسی طرح فقیر بھی پیر کا لاحقہ بن کر صوفی یا مرشد کے لئے پیر فقیر استعمال ہو رہا ہے حالانکہ صوفی و مرشد کے لیئے پیر فقیر کا لفظ کوئی معنوی مناسبت نہیں رکھتا۔ پھر بھی پیر کو شیخ کے معنی میں لیا جاتا ہے چہ جائیکہ وہ مرشد چالیس سال کا ہو، بہر حال پیر کے ساتھ فقیر کا لفظ اسلئے استعمال ہونے لگا کہ مرشد بھی اموال دنیا کو چیز سے ہیچ سمجھ کر اس سے بچنے لگے اور پیش آمدہ تمام فتوحات و نذرانے لنگر کی نذر کرنے لگے۔ گویا دنیا سے بے رغبتی کے پیش نظر ان صالح بندوں کو فقیر بھی کہا جانے لگا۔ حضرت خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں۔ فقیر کی شناخت یہ ہے کہ وہ دنیا اور اموال دنیا سے کنارہ کش رہتا ہے اور اچھی آخرت کے لئے اسباب کی تلاش میں رہتا ہے (۳) امام جعفر صادق کا قول بھی ایسے صالحین کے طرز عمل پر صادق آتا ہے کہ فقیر کے خالی ہاتھ صرف درگاہ الٰہی میں پھیلتے ہیں مگر اس کے سوال میں متاع دنیا نہیں بلکہ متاع آخرت کی التجا ہوتی ہے (۴)۔

لفظ فقیر چار حرفوں کا مجموعہ ہے یعنی ف، ق، ی، ر۔ اگر ان حرفوں کو الگ الگ الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو اسکی شکل اس طرح بھی بن سکتی ہے ف سے فاقہ۔ ق سے قرآت۔ ی سے یاری یا یادِ الٰہی۔ ر سے ریاضت اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ف سے فاقہ۔ یہ انسانی فطرت کا لازمہ ہے کہ جب وہ کسی اہم کام کو انجام دینے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے تو وہ خود کو بھی اور اپنے وقت کو بھی اس کام کے لئے وقف کر دیتا ہے یہاں تک کہ بھوک و پیاس کی بھی پرواہ نہیں کرتا یعنی اس مہم کو سر کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے تب وہ نیند، غنودگی اور کاہلی سے بچنے کے لئے فاقہ یا بھوک کا سہارا لیتا ہے اور یہ فاقہ یا بھوک اضطراری و اضطرابی نہیں بلکہ خود اختیاری ہوتی ہے۔

ہر انسان اپنی فطرت کے تتبع میں بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا ہے اور اپنے عقل و شعور سے نیک و بد میں امتیاز کرتے ہوئے وہ ایک راہ کا انتخاب کرتا ہے کبھی تو وہ ماحول و معاشرہ سے متاثر ہو کر بھٹک جاتا ہے اور کبھی وہ اچھی صحبت کے زیر اثر مقصد حیات کو سمجھ کر خالق و معبود کے قرب کی راہ کا سالک بن جاتا ہے فطرت سلیم کا مالک یہی وہ سالک ہے جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ دنیا کو فانی اور آخرت کو باقی تصور کرتا ہے اس لیئے دائمی حیات کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد کرتا ہے اور یہ یقین کرتا ہے کہ حیات اخروی کا مقصد دیدار الٰہی ہے چنانچہ وہ دنیا میں قرب الٰہی کو آخری منزل تصور کر کے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تب وہ عیش و عشرت کو ٹھکرا کر زہد و ریاضت کی راہ اپناتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کو محض آخرت بہتر کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسطرح وہ قرب الٰہی کے حصول کے لئے کامیابی سے منازل طے کرتے رہتے ہیں اور بالآخر وہ اپنے مطلوب و مقصود تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

قرب الٰہی کے حصول کے لیئے یہ شرط ہے کہ جہد مسلسل میں سستی نہ آنے پائے تو اس راہ کے سالکین نے نیند، غنودگی اور سستی سے بچنے کے لئے خود اختیاری فاقہ کو اپنے اوپر مسلط کیا اور اپنی اس فاقہ کشی کو روزے کا نام دیا۔ اسکی دلیل انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام کے عمل سے لی۔ گویا فاقہ کشی بلکہ دائمی روزہ داری اپنے طے شدہ امر کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے اور صوفی فقیر اس عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس تکلف سے وہ روحانی فوائد حاصل کرتا ہے تو گویا اسکے تقویٰ کی بنیاد خود اختیاری فاقہ کشی اور مسلسل روزہ داری ہے۔

یہی فاقہ، زیادہ جاگنے اور ذکر الٰہی میں زیادہ مصروف رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے بزرگان دین محض زندہ رہنے کے لئے (قوت لایموت) کھاتے ہیں اور یہی کم خوری، شب بیداری میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمہ نے بھوک کی طلب کو کچلنے کے لئے لکڑی کی روٹی اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔ غرض کہ عبادت کے لئے شب بیدار رہنے والے صحابہ کرام بھی تکلی

روزے رکھتے تھے اور انکی سحری و افطاری برائے نام ہوتی تھی بلکہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ایسا ہی فرماتے تھے۔ لہذا صالحین و مرشدین جو فاقہ اپناتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کے زہد و ریاضت میں تسلسل برقرار رہے اور قرب الٰہی کا حصول ان کے لئے آسان ہو جائے۔

ق سے قرأت۔ قرب الٰہی کے حصول کا دوسرا ذریعہ یا دوسری ریاضت قرأت ہے، عرف عام میں قرأت پڑھنے کو کہتے ہیں اور جو قرآن کو خوش الحانی سے پڑھتے ہیں وہ قاری کہلاتے ہیں لیکن فقہاء کے عرف میں قاری و مقری اسے کہتے ہیں جو تفہیم قرآن میں گہرا شغف رکھتا ہو اور اسکے مفاہیم و مرادات کو سمجھنے میں خاصہ درک رکھتا ہو۔ یہاں قرأت سے ہماری مراد کثرت تلاوت ہے جسے فقیر اپنا ورد بنا لیتا ہے اور دوران تلاوت یہ تصور کرتا ہے کہ وہ اپنے معبود و محبوب حقیقی سے شرف تکلم حاصل کر رہا ہے وہ اس انداز تکلم کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہی اس کا مقصود بھی ہے اس لئے وہ ہر وقت صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہوئے کہتا ہے اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين۔ یعنی اے اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا، راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا۔ نہ ان کا راستہ جو تیرے غضب کا شکار ہوئے اور نہ گمراہوں کا (۵) گویا کہ فقیر اللہ تعالیٰ سے نظری اور عملی ہدایت کی استدعا کرتا ہے اور قرب الٰہی کے حصول کے لیئے اس راستہ پر چلنا چاہتا ہے جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا اختیار کردہ راستہ ہے یعنی وہ ان منعم علیهم ہستیوں کے اسوۂ حسنہ کی تصویر بننا چاہتا ہے۔

ی سے یاری۔ یاری اردو زبان میں دوستی کو کہتے ہیں جبکہ فارسی زبان میں مدد و معاونت بلکہ استعانت کو کہتے ہیں۔ جب یہ فقیر، فاقہ و قرأت کی منزلیں عبور کر کے صرف اللہ سے دوستی کر لیتا ہے اور اپنے جملہ معاملات میں صرف اللہ ہی سے استمداد و استعانت طلب کرتا ہے اور اسے ہی حقیقی کارساز سمجھتا ہے تو وہ یقین کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کے دل کو قرار اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اس طرح وہ اپنے مقصد حیات کو سمجھ لیتا ہے۔

حب الٰہی میں بھوکا رہنا، شب بیدار رہنا، دست سوال دراز کرنا اپنا شیوہ بنا لیتا ہے، اس کا یہی عمل اسے ولایت کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتا ہے۔ يحبهم و يحبونه (القرآن) کا سماں بندھ جاتا ہے۔ وہ یاد الٰہی میں مستغرق رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتا ہے۔ یہی فاذکرونی اذکرکم (القرآن) کی تعبیر ہے۔ تب اللہ تعالیٰ اپنے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقیروں اور ولیوں کی پہچان ان لفظوں میں کرواتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون اللذین امنو و کانوا یتقون ۔خبردار بیشک جو اللہ کے دوست ہیں انہیں نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم زدہ ہوتے ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں (۶) جب فقیر اس مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو اس کا اللہ سے رابطہ جڑ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیر مہر علی شاہ مجدد گولڑوی نے کہا تھا۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا　　　گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

یہ فقیر اپنے شب و روز یاد الٰہی میں صرف کرتے ہیں۔ کبھی ذکر میں کبھی فکر میں کبھی دست بستہ قیام میں کبھی رکوع و سجود میں کبھی تلاوت میں کبھی کسی ریاضت میں غرض اس کی یاد میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ اس کے سوا سب کو بھول جاتے ہیں۔ پھر ان کا جی نہیں بھرتا۔ یعنی ان کی یاری صرف اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ اور اسی کو وہ ہر شے کا حقیقی مالک یقین کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسکی چند روزہ امانت سمجھ کر گزارتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی طرف لوٹ جانے کو تیار رہتے ہیں اور اپنے اس عمل کو قرآن کی اس آیت کی تعبیر سمجھتے ہیں الذین یظنون انھم ملقوا ربھم وانھم الیہ راجعون۔ جو جانتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یقیناً وہ اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (۷)

در حقیقت مالک ہر شے خدا است　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

ر سے ریاضت۔ ریاض عربی میں باغ کو کہتے ہیں، باغیچے کو باغ کی شکل میں لانے کے لئے پودوں میں پانی، کھاد اور گوڈی جیسے عمل کو مسلسل جاری رکھنا ہوتا ہے جب تک پودے، پیڑ نہ بن جائیں تو گویا ریاضت نام ہے کسی کام کو بار بار دہرانے اور اس میں تسلسل کو قائم رکھنے کا اسی طرح فقیر بھی فاقہ، قرأت اور یاری جیسے عمل کے ساتھ قرب الٰہی کے سمندر میں مسلسل غوطہ خوری کرتا رہتا ہے۔ تا کہ اس کی زندگی کے تمام لمحات اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہو جائیں۔ ریاضت کو سمجھنے کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے شعبے ایسے ہیں جس میں ریہرسل کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ان میں فوج ایک ایسا ادارہ ہے جس میں اس کی اہمیت نسبتاً باقی اداروں سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن یہاں جو مثال پیش کرنا چاہتا ہوں وہ تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنے والے ایک قاری کی ہے، ایک اچھا قاری محفل حسن قرأت میں خوب سے خوب تر اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کے لئے مسلسل ریہرسل یعنی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس کے لئے وہ کئی کئی گھنٹے مختلف لہجوں اور قرأتوں میں پڑھنے کی پریکٹس کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی آواز

کو سلامت اور خوش الحانی کو قائم رکھنے کے لئے لذائذ دنیا اور چٹخارے دار چیزوں سے پرہیز کرتا ہے تب وہ اپنے فن میں ایسی مہارت اور انداز تلاوت میں ایسا کمال حاصل کر لیتا ہے کہ لوگ اسے نامور قاری اور استاذ القراء تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور وہ خود بھی اپنی محنت کے رنگ کو محسوس کرتا ہے۔

اسی طرح فقیر بھی ریاضت کرتا ہے، شب بھر جاگتا ہے اور مختلف اوراد و اذکار اور عبادات میں مصروف رہتا ہے جن عبادات کو شروع کرتا ہے عمر بھر ان کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ اپنی التجاء و سوالات کے جدید خوبصورت انداز اختیار کرتا ہے۔ جس کا مقصد وحید محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہوتا ہے اور یہ کہ روز قیامت اسے اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ اسی لئے فقیر ہر وقت یاد الٰہی میں مگن رہتا ہے۔ اور اپنے اعمال میں روز افزوں حسن و خوبصورتی پیدا کرنے کی جدو جہد کرتا ہے۔ اسی جدو جہد اور عمل مسلسل کا نام ریاضت ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

وہ حسن ہی نہیں ہے جو ہو جائے مطمئن　　　وہ عشق ہی نہیں ہے جو ثابت قدم نہ ہو

فقیر جب فقیری کا لباس زیب تن کر لیتا ہے تو پھر وہ حلقۂ یاران الٰہی میں داخل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسکی یاری و دوستی پکی ہو جاتی ہے وہ دنیا سے بے غرض ہو جاتا ہے اور اس کا مطمع نظر آخرت ہوتی ہے ایسے فقیر کو ارباب دنیا الگ نظر سے دیکھتے ہیں اور ارباب نظر اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ دوستی کرنی ہے تو اللہ سے کرو جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یاری و یاری میں فرق ہے کچھ جلد باز دنیاوی فوائد کے لئے ایسوں سے یاری جوڑ لیتے ہیں جو خود کسی کے محتاج ہوتے ہیں اور بعض کی یاری اس سے ہوتی ہے جسکے سب محتاج ہیں یہی لوگ فقیر ہیں اور یہی دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں۔ ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ

ہر جلوے کو دیکھا تیرے جلووں سے منور　　　ہر بزم میں تو انجمن آرا نظر آیا
ہست جہاں ہو رہا ہے　　　ہے یاری جو ہر ایک شے میں

حوالہ جات

۱۔ سورۃ آل عمران ۱۸۱　　　۲۔ حاشیہ کنز الدقائق کتاب الزکوۃ ص ۲۷۱
۳۔ اشارات فریدی ج ۳ ص ۲۸۰　　　۴۔ فرمودات امام صادق مطبوعہ ایران
۵۔ سورۃ فاتحہ　　　۶۔ سورۃ آیت　　　۷۔ سورۃ بقرہ آیت ۳۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خودکشی کا افسوسناک رجحان

مسئلہ کی شرعی حیثیت، سماجی و معاشی محرکات وعوامل، گزارشات

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل (حکومت پاکستان)

مغربی ممالک اور دنیا کے دیگر ممالک میں خودکشی کا رجحان (Phenomenon) ہمیشہ ایک خاص تناسب کے ساتھ جاری رہا ہے بلکہ چند سال قبل جاپان میں اجتماعی خودکشی کے واقعات بھی رونما ہو چکے ہیں، لیکن الحمد للہ عالم اسلام اکا دکا نادر الوقوع واقعات کے علاوہ اس لعنت سے ہمیشہ محفوظ رہا ہے اور اس رجحان نے کبھی بھی ایک رویے کی شکل اختیار نہیں کی، لیکن بد قسمتی سے گزشتہ چند ماہ سے تواتر وتسلسل کے ساتھ خودکشی کے سانحات رونما ہوئے ہیں، اور اس افسوسناک رجحان نے معاشرے کے اجتماعی ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے، اور اہل فکر ونظر نے اس مسئلے کی سنگینی پر توجہ دی ہے۔ سطور ذیل میں ہم اس افسوسناک رجحان کے شرعی پہلو، سماجی و معاشی محرکات وعوامل اور منفی اثرات پر قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں اور ارباب حل وعقد اور اہل نظر کی توجہ کیلئے چند اہم گزارشات پیش کریں گے۔

اسلام میں خودکشی حرام ہے:

اسلام کی رو سے انسان اپنی جان کا مالک ومختار نہیں ہے، انسان کی جان اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اسکی ودیعت وامانت ہے۔ انسان کو صرف اس جسم وجان کے تصرف واستعمال کا اختیار دیا ہے اور اس کیلئے شریعت نے حدود وقیود بھی مقرر فرما دی ہیں، اسی تصرف اختیاری پر جزا وسزا کا مدار ہے۔ انسان چونکہ اپنے جسم وجاں کا مالک نہیں ہے، اس لئے اسے اپنی جان یا کسی عضو کو تلف کرنے، کاٹ پھینکنے یا فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہے، یہ تمام افعال وتصرفات ممنوع اور حرام ہیں، جان لینے اور تلف کرنے کا

اختیار صرف اسی قادر مطلق اور خالق ازل کا ہے جس نے یہ جان تخلیق فرمائی ہے، وہ جب چاہے اپنی اس امانت کو واپس لے سکتا ہے، کسی کو مجال انکار نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) "اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (بقرہ:۱۹۵)"۔

(۲) "اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے (النساء:۲۹)"۔

خودکشی گناہ کبیرہ ہے:

اسلام میں خودکشی گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب جہنم کا سزاوار ہوگا، دنیا میں تو وہ ایک مرتبہ اپنی جان تلف کرتا ہے، لیکن اس کی سزا کے طور پر اسے طویل عرصے تک اور لاتعداد بار اس اذیت سے گزرنا پڑے گا، غور فرمایئے اس کا انجام کتنا عبرت ناک اور ہولناک ہے۔ صحیح مسلم کتاب الایمان میں حدیث ہے: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی آہنی ہتھیار سے خودکشی کرے تو جہنم میں وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اس ہتھیار سے ہمیشہ جہنم میں اپنے آپ کو زخمی کرتا رہے گا، اور جو شخص زہر سے خودکشی کرے گا، تو وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھاتا رہے گا، اور جو شخص کسی پہاڑ (یا بلند و بالا عمارت و مینار) سے گر کر خودکشی کرے گا تو وہ (اس عمل کی سزا کے طور پر) ہمیشہ جہنم (کے گہرے گڑھوں) میں گرتا رہے گا"۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ طفیل بن عمرو دوسی اپنی قوم کے ایک شخص کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے، ان کا وہ ساتھی مدینہ طیبہ میں بیمار ہو گیا، جب بیماری کی تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تو اس نے ایک لمبے تیر کے پھل سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، اس کے نتیجے میں اس کے دونوں ہاتھوں سے اتنا خون بہہ نکلا کہ اسی سبب سے اس کا انتقال ہو گیا، حضرت طفیل نے اسے خواب میں اچھی حالت میں دیکھا، لیکن اس نے اپنے دونوں ہاتھ لپیٹے ہوئے تھے، حضرت طفیل نے اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟، اس نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کی برکت سے بخش دیا، حضرت طفیل نے پوچھا: یہ ہاتھ تم نے کیوں لپیٹے ہوئے ہیں؟، اس نے جواب دیا: "مجھے (ذات باری تعالیٰ کی جانب سے) یہ کہا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑا ہے، اسے ہم درست نہیں کریں گے، حضرت طفیل نے جب یہ خواب نبی کریم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بیان کیا، تو آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! (میرے) اس صحابی کی ہاتھوں کی خطا کو بھی معاف فرما"۔ غور فرمایئے! وہ شخص تو صحابی رسول تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے ہجرت کے شرف سے نوازا تھا، بلاشبہ اس نے موت سے پہلے اپنی اس خطا پر صدق دل سے توبہ بھی کر لی ہوگی، اور حضور انور ﷺ کے وسیلۂ جلیلہ سے توبہ قبول بھی ہوگئی، لیکن اس کے باوجود اس گناہ کبیرہ وقبیحہ کی علامت کے طور پر اس کے ہاتھ لپیٹے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے تھے، جنتی اپنی اصلی حالت پر ہرگز سلامت نہیں تھے، اس لئے انہوں نے اس ... اپنے دامن میں نہیں لپیٹ رکھا تھا، اللہ جل شانہ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے وسیلۂ شفاعت سے ان کی کلی مغفرت فرمادی، لیکن صحابیت، ہجرت اور دیدار مصطفی ﷺ کا شرف رکھنے والا آج کے دور میں تو کوئی نہیں ہوسکتا۔

زیست نعمت ربانی اور موت اختیار خالق:

پس اسلام کی رو سے زیست نعمت باری تعالیٰ اور موت اختیار خالق ہے، یہ دونوں امور بندے کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اس نے موت اور زندگی کو تمہاری آزمائش کیلئے پیدا کیا کہ تم میں سے کس کا عمل سب سے بہتر ہے (الملک:۲)"۔ جو حیات کو پیدا کرنے والا ہے، اسے سلب کرنے کا حق بھی اسی کو حاصل ہے، اس لئے حدیث پاک میں موت کی تمنا کرنے اور موت کی دعاء کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، کون جانتا ہے کہ آنے والے لمحات میں کسی کیلئے خزانۂ قدرت میں کون سی خیر مستور ہے، چشم فلک نے بارہا لوگوں کے حالات کو پلٹتے ہوئے، تنگدستی کو فراخی رزق سے، اذیت کو راحت سے، مرض کو صحت سے، ضعف کو قوت سے اور محکومی کو اختیار واقتدار سے بدلتے دیکھا ہے، کوئی کیونکر فرض کرلیتا ہے کہ آنے والے کل کے دامن میں اس کے لئے امید کی کوئی کرن، چین کا کوئی ذرہ، راحت کا کوئی لمحہ اور کامیابی وکامرانی کی کوئی نوید جانفزا نہیں ہے، غیب کا علم تو ذات باری تعالیٰ کو ہے، اس لئے کوئی شخص زندگی کی کلفتوں سے اگر بہت زیادہ اکتا گیا ہے، اسے اپنی کم ہمتی، کوتاہ بینی اور بے بضاعتی کی وجہ سے اگر موت ہی کی دامن میں عافیت نظر آتی ہے اور وہ ناامیدی کی اس انتہا کو پہنچ گیا ہے، تب بھی اسے علی الاطلاق موت کی دعاء کی اجازت نہیں دی گئی، حدیث پاک میں ہے:

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو کوئی دکھ اور مصیبت پہنچی ہے تو اس کے باعث موت کی تمنا بالکل نہ کرے، اور اگر وہ لازماً کرنا ہی چاہتا ہے تو (مستقبل کا حال اور علم اللہ کے سپرد کرکے) اسے چاہئے کہ یوں کہے، اے اللہ! (تیرے علم کے مطابق) جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے تو تو مجھے (اس وقت تک) زندہ رکھ، اور جب (تیرے علم کے مطابق) میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے (ایمان کی) موت عطا فرما۔ (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)"۔

قرآن وحدیث کے ان صریح ارشادات کی روشنی میں کوئی صاحب ایمان خودکشی کا تصور بھی نہیں کرسکتا، یہ تو وہ کرے جسے یقین راسخ ہو کہ موت واقع ہونے کے ساتھ ہی فوز وفلاح اور راحت وسکون کی کوئی اعلیٰ منزل اس کی منتظر ہے، لیکن نصوص قطعیہ سے جب یہ بات ثابت ہے کہ نار جہنم کے شعلے اس کے منتظر ہیں، تو اسے اس فعل قبیح کا سوچنا بھی نہیں چاہئے۔

دینی شعور وآگہی کا فقدان:

ہمارے معاشرے میں حال ہی میں رونما ہونے والے خودکشی کے رجحان اور اس لہر کا سب سے بڑا سبب دینی تعلیمات سے دوری ہے اور دینی شعور وآگہی کا فقدان ہے، اور حکومت کے زیر کنٹرول سب سے مؤثر میڈیا، الیکٹرانک میڈیا ہے، وہ فحاشی، عریانی، تشدد، دہشت اور شر کے فروغ میں تو ہمہ وقت مصروف ہے، مگر دینی شعور کی آگہی پیدا کرنا اس کی ترجیحات میں نہیں ہے، اور ہمارے پرنٹ میڈیا کا رول بھی زیادہ قابل رشک نہیں ہے، لہٰذا سب سے اولین ترجیح دینی شعور وآگہی کے فروغ کو دینی چاہئے، کیونکہ ہمارے معاشرے میں خودکشی کا مرتکب شخص اپنی عاقبت کو تو برباد کرتا ہی ہے، اپنی ذات سے وابستہ کئی دوسرے افراد کی زندگیوں کو بھی ناقابل برداشت اذیت اور لاینحل مسائل سے دوچار کردیتا ہے۔

معاشی مسئلہ:

خودکشی کے بہت سے واقعات کے پس پشت بے روزگاری، تنگ دستی، فاقہ کشی اور معاشی محرومیوں کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری وقت کے اہل اقتدار پر ہوتی ہے، اس کے بعد معاشرے کے ان طبقات پر جو چند سو یا چند ہزار افراد یا خاندانوں پر مشتمل ہیں لیکن ملک کے اسی فیصد وسائل پر قابض ہیں، اور بدقسمتی سے ہمارے اہل اقتدار بھی اس طبقے کا حصہ بلکہ سرخیل ہیں۔ اسلام ارتکاز دولت کے خلاف ہے کہ چند لوگ سارے وسائل پر قابض ہوں اور لوگوں کی اکثریت "قوت لا یموت" سے بھی محروم ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ایسا نہ ہو کہ (ساری دولت) مالداروں ہی کے درمیان گردش کرتی رہے (الحشر:۷)"۔

اسلام دولت اور وسائل رزق کی تقسیم کا حکم دیتا ہے تاکہ ان کا فیض ساری انسانیت کے لئے عام ہو، اسلام کا اگر ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان اپنی جان کا مالک ومختار نہیں بلکہ صرف متصرف ہے، مال ودولت کے بارے میں بھی اس کا نظریہ یہی ہے کہ اس کا مالک حقیقی وہی ہے جس نے اسے تخلیق کیا ہے، انسانوں کی طرف ملکیت کی نسبت مجازاً ہے، اور دولت کے کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے کے لئے حلال وحرام اور فضل واحسان کے بڑے جامع اصول اسلام نے عطا کئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور (آخر) کیا سبب ہے کہ تم (اپنی دولت کو) راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے وہ (درحقیقت) اللہ ہی کی ملکیت ہے، (الحدید:۱۰)"۔ اور اسلام یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ غرباء کو اس نظریے سے جذبۂ تکبر وتفوق کے ساتھ نہ دو کہ تم ان پر احسان کررہے ہو، بلکہ یہ سمجھ کر دو کہ تمہارے مال میں ان کا حق ہے جو تم انہیں لوٹا کر اپنے دینی فریضے سے عہدہ برا ہورہے ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ان (اہل ثروت) کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے، (الذاریات:۱۹)"۔ اور دوسرے مقام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر فرمایا: "اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے، پس جن کو فضیلت دی گئی ہے، وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزاق اپنے غلاموں (اور زیر دستوں) کو لوٹا دیا کریں، تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمت کا انکار کر رہے ہیں۔ (النحل: ۷۱)"۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے، تو اسے ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقراء کی طرف لوٹا دیا جائے، (صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ)"۔

جب نظام مملکت وحکومت میں تقسیم دولت کا منصفانہ اور عادلانہ نظام نہیں ہوگا، تمام تر وسائل دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائیں گے، تو معاشی ناہمواریاں اور محرومیاں جنم لیں گے، اور اسی طرح کے سانحات رونما ہوتے رہیں گے اور خدانخواستہ یہ حالات طبقاتی تصادم پر بھی منتج ہو سکتے ہیں، مغربی ممالک میں بھی ارتکاز دولت اور سرمایہ دارانہ نظام اپنے عروج پر ہے لیکن وہاں بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی ہر شہری کے لئے ممکن یا لازمی بنادی گئی ہے اور تعلیم، معاش اور ترقی کے ہر میدان کو مسابقت (Competition) کیلئے کھلا رکھا گیا ہے، میرٹ اور اہلیت پر اقربا پروری، رشوت کی گرم بازاری اور لوٹ کھسوٹ کو ترجیح نہیں دی گئی، یہ خرابیاں ان کے ہاں بھی بلاشبہ ہیں لیکن قابل برداشت حد تک۔

سماجی مسئلہ:

ان سانحات کا ایک سبب ہمارے متضاد رویوں پر مبنی سماجی حالات ہیں، گھریلو ناچاقیاں اور شادی کے مسائل پر والدین اور اولاد کی ترجیحات کا ٹکراؤ ہے، اور ان معاملات میں ایثار، تحمل (Tolerance)، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے مطابقت پیدا کرنے (Adjustability) سے کلی انکار اس کا سبب ہے، ایک طرف ہمارے ہاں کافی حد تک آزاد روی رائج ہو گئی ہے، بیشتر تعلیمی اداروں اور بالخصوص اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نظام تعلیم مخلوط ہے، رہی سہی کسر ٹی۔وی نے پوری کر دی ہے، بلکہ اس نے تو غضب ہی ڈھا دیا ہے اور اب ہماری دیہی آبادی کا غالب حصہ اس کی زد میں ہے، یہ وہ فحاشی ہے جو جبراً مسلط کر دی گئی ہے، ممکن ہے کچھ لوگ اپنے دل کو یوں تسلی دیتے ہوں کہ ہماری بچیاں نقاب اوڑھ کر جاتی ہیں، بلاشبہ اخلاقی تنزل کے اس دور میں یہ بہت بڑا جہاد ہے اور بڑے اجر کی بات ہے لیکن جہاں انہیں جانا ہے، وہاں تو ماحول بے حجاب بلکہ بے قابو ہے، جبکہ ماحول میں ایمان وعرفان اور نورانیت کی بہاریں اپنی اوج کمال پر تھیں، اس عہد مبارک میں احتیاط کا عالم کیا تھا، ملاحظہ کیجئے: "حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کا واقعہ ہے کہ میں اور حضرت میمونہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں کہ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم حاضر خدمت ہوئے، حضور نے فرمایا: "تم دونوں پردہ کرو"، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ وہ تو نابینا ہیں، نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ پہچان سکتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو، کیا تم دونوں ان کو دیکھ نہیں رہی ہو؟ (جامع

ترمذی: کتاب الادب)"۔

لہٰذا میری والدین سے دردمندانہ گذارش ہے کہ وہ اولاً تو اپنی اولاد کی دینی واخلاقی تربیت پر بچپن سے توجہ دیں، انہیں حالات اور ماحول کے رحم وکرم پر نہ چھوڑیں، شادی کے مسئلے میں فقہ حنفی کی رو سے اولاد کی رضامندی ضروری ہے، اور والد سرپرست (ولی) کے حقوق کا بھی کافی حد تک تحفظ کیا گیا ہے، دونوں میں کافی حد تک توازن ہے، اگر رشتے کے سلسلے میں بیٹے یا بیٹی کا انتخاب اپنا ہے اور وہ درست ہے تو اسے قبول کیجئے، نامناسب ہے تو دلائل سے اپنی اولاد کو قائل کیجئے، اگر وہ تسلیم کرلیں تو آپ کی خوش نصیبی اور ان کی سعادت مندی ہے، اور نہ مانیں اور کسی صورت نہ مانیں تو ذہنی مطابقت کی صورت پیدا کیجئے، عالم شباب میں بلاشبہ انسان جذبات کی زد میں بہہ جاتا ہے، اس کی غلطی کا امکان اسی فیصد تک ہو سکتا ہے تو والدین بھی تو خطا سے معصوم نہیں ہیں، بیس فیصد غلطی کا امکان ان کے فیصلے، رائے اور اجتہاد میں بھی ہو سکتا ہے، اور اس کی مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، لہٰذا جہاں عقل جواب دے جائے، وہاں معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے، اور اس کی تقدیر پر راضی وشاکر ہو کر مفاہمت ومطابقت اور ایثار کا ماحول پیدا کرنا چاہئے، گزشتہ سال بھر میں کتنے ایسے واقعات اخبارات کی زینت بنے، والدین، خاندان اور خود بچیوں کی رسوائی ہوئی، قتل وتشدد تک نوبت آپہنچی، لیکن ناکامی ونامرادی اور رسوائی کے سوا کیا ہاتھ آیا۔

خودکشی کے ہر واقعے کا انفرادی تجزیہ ضروری ہے:

یہ ضروری نہیں کہ خودکشی کے ہر واقعے کے پیچھے ایک ہی نوعیت کے عوامل کارفرما ہوں، حقائق تک رسائی کیلئے ہر واقعے کا جدا جدا سائنٹیفک تجزیہ ضروری ہے، ہو سکتا ہے بعض واقعات کے پیچھے قتل عمد کا سنگین جرم کارفرما ہو اور خودکشی کی عام لہر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمال عیاری سے اسے خودکشی کا رنگ دے دیا گیا ہو، ماضی میں بعض مشہور قتل کے واقعات کا ذہانت سے تعاقب کیا گیا تو وہ دانستہ انتقامی قتل کے واقعات نکلے، مغربی ممالک میں قارسولا تفتیش کی روش سے ہٹ کر ہمیشہ ہر سانحے یا اہم واقعے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ اکثر کامیابی پر منتج ہوتی ہے۔

خودکشی کی راہ اختیار کرنے والوں سے گزارش:

خودکشی پست ہمتی، بزدلی، قنوطیت (Desparateness)، یاس وحرمان اور بے عملی کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ بحیثیت مجموعی معاشرے کے تنزل، پژمردگی، اضمحلال اور احساس شکست کی آئینہ دار ہے، یہ کسی صحت مند معاشرے کی علامت ہرگز نہیں ہے، انسان کی اصل متاع اور اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ایمان وایقان، عزم وہمت، جذبۂ عمل اور بدی کی قوتوں سے زبردست قوت مزاحمت ہے۔ شکست خوردہ ذہنیت کے حامل لوگ خودکشی کی راہ پر چل پڑتے ہیں، کیونکہ ان میں زندگی کے حقائق اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصائب کا سامنا کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہوتا۔ زندہ دل، بیدار مغز، اولوالعزم اور قوت ایمانی کے حامل لوگ عالی ہمتی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں، گر گر کر پھر اٹھتے ہیں، اگر جھپٹ کر پلٹتے ہیں تو پلٹ کر پھر جھپٹتے ہیں، دکھ سہتے ہیں، دکھ پالتے نہیں، اور آخر کار کامیابی ان کا مقدر ہوتی ہے، جان ہی دینی ہے تو ''جان آفریں'' کے نام پر دیجئے، کسی مجاہد کی راہ پر چلئے، یا پھر تمام مستضعفین (Depressed) اور مظلومین اور ستم رسیدہ (Oppressed) مل کر ایمانی قوت سے سرشار ہو کر اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے اٹھ کھڑے ہوں، اگر اللہ کا دین اور نظام مصطفیٰ ﷺ اپنی اصل، کامل اور جامع شکل میں نافذ ہو جائے تو پھر اس کے سائے میں سب کیلئے امان ہوگا، عافیت ہوگی، ہر ایک کے دکھ کا درماں اور درد کا مداوا ہوگا، دنیا بھی سکون کا گہوارہ ہوگی اور عاقبت بھی فلاح کی ضامن ہوگی۔

سیاسی زعماء سے گزارش:

انسانی جان بڑی قیمتی چیز ہے، یہ خالق ازل کی شان تخلیق کا سب سے بڑا مظہر ہے، اس کے ضیاع و اتلاف اور ہلاکت کو نہ تو اپنی تائید و حمایت کا میزان و معیار بنائیں، نہ اس پر جشن منائیں، نہ اس کی ترغیب دیں اور نہ اس کی حوصلہ افزائی کریں، بلکہ اس پر کف افسوس ملیں کہ ہم نے آزادی کے باون سال بعد ملک و قوم کو کس مقام پر پہنچا دیا ہے اور اس صورت حال کے ازالے کے لئے ہمیں کیا تدبیر اختیار کرنی چاہئے، وجود انسانی کا آبگینہ توڑنا نہیں، جوڑنا عبادت ہے، قدرت تو خود اپنی اس تخلیق اور شاہکار پر ناز کرتی ہے، ارشاد فرمایا: ''اور اس نے تمہاری صورت بنائی اور کیسی حسین صورت بنائی اور (تمہیں) اسی کی جانب لوٹنا ہے، (التغابن: ۳)''۔ یہ جان اگر قربان ہو تو اسی کے نام پر جس نے اسے تخلیق کیا، اور اس شان نیاز مندی کے ساتھ کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!
(اقبال)

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

فرقان کیا ہے؟

سوال: سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۲۹ میں ہے۔ تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہیں فرقان عطا فرمائے گا کہ کیا صحیح ہے؟ کیا غلط ہے؟ کیا اس کا تعلق علم، سائنس، ذہن انسانی کے ارتقاء و ایجادات سے نہیں ہے؟ کیا یہ صرف عطیہ ربانی ہے؟ عطیہ انسانی ارتقاء نہیں ہے؟ غنی جیم (کراچی)

میرے محترم! آپ کے سوال کا تعلق، جس آیت سے ہے وہ الفرقان میں نہیں بلکہ الانفال میں ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔ یا ایھا الذین امنو ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقان و یکفر منکم سیئاتکم و یغفر لکم واللہ ذوا الفضل العظیم۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے قوانین پر چلو تو وہ تمہیں صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور فرمائے گا۔ اور تمہاری غلطیوں کو تم سے دور فرمائے گا اور (آئندہ کی غلطیوں سے تمہاری) حفاظت فرمائے گا۔ اس آیت میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کا صلہ درج ذیل نتائج کی صورت میں بیان ہوا ہے۔

۱۔ فرقان ۲۔ کفارہ سیئات ۳۔ اور آئندہ غلطیوں سے (حفاظت)

آیت میں موجود ''ان'' حرف شرط ہے جیسے اردو میں اگر مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اللہ کا تقویٰ اختیار کیا تو تمہیں ان نعمتوں سے بہرہ ور کیا جائے گا۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے تقویٰ اللہ اختیار نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ان نعمتوں سے دور کر دیے جاؤ گے۔

میرے محترم! آپ نے چونکہ ''فرقان'' کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس لیے ''جعل فرقان'' کا سبب اصلی (علت) جانے بغیر، آپ فرقان (اور دوسری دو حقیقتوں کو) نہیں سمجھ سکتے۔ واضح رہے کہ اس مقام پر ''فرقان'' کسی موجود فی الخارج شے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اللہ کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی شے کو ہی فرقان کہا گیا ہے۔ ''تقویٰ اللہ'' دراصل اللہ کا نازل کردہ وہ قانون ہے، جسے اختیار کرنے کے صلے میں، یہ نتائج آپ سے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ نتائج خداوند عالم کے قانون مشیت کے تحت پیدا ہوتے ہیں اس لیے خدا ہی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تقویٰ اختیار کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ناگزیر نتائج بلکہ فوائد و ثمرات کو بطور جزاء کے خود ہی بیان بھی فرما دیا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ فرقان کیا ہے؟ تو آیئے اسکی تفصیل جاننے کے لئے ہم قرآن مجید سے رہنمائی لیتے ہیں۔ المعجم المفہرس للالفاظ القرآن الکریم کے مطابق لفظ "الفرقان" چھ مقامات پر آیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی آیت سورۂ بقرہ/۵۳ میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ و اذ اتینا موسیٰ الکتاب و الفرقان لعلکم تہتدون ۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دی تا کہ (اے قوم موسیٰ) تم کامیاب و کامران ہو سکو۔

آپ نے دیکھا کہ موسیٰ کو کتاب اور فرقان دینے کی بات کی گئی ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیت میں موجود "واؤ" کو اگر "تفسیری" معنی میں لیا جائے تو یہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہوں گے ۔ یعنی کتاب کی حقیقت، حق و باطل کے درمیان فرق کر دینے کی ہوگی اسلئے فرقان سے مراد بھی وہی کتاب ہے جو موسیٰ کو دی گئی۔ لیکن "واؤ" کو اگر "عاطفہ" مانا جائے تو پھر یہ دو الگ الگ حقیقتوں کے دو الگ الگ نام ہوں گے۔ یعنی جس طرح کتاب موجود فی الخارج کسی حقیقت کا نام ہے تو فرقان بھی کسی ایسی ہی دوسری حقیقت کا نام ہے۔ جو پیغمبر (موسیٰ) کی نبوت کی سچائی کا ایک کھلا ہوا نشان بنکر ظاہر ہوئی۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں فرقان کے لفظ میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا بیان ہے۔

میرے محترم! آپ نے فرق ملاحظہ کیا آپ کے سوال کے جواب میں اوپر بتایا گیا تھا کہ وہاں لفظ فرقان، خارج میں موجود کسی شئے کے طور پر نہیں آیا ہے۔ جبکہ یہاں وہ ایک ایسی حقیقت کے طور پر آیا ہے۔ جو خارج میں موجود ہے۔ کیا سمجھے آپ؟

میرا مطلب ہے کہ سورۂ انفال کا "فرقان" تقویٰ کا نتیجہ ہے، جبکہ سورۂ بقرہ کا "فرقان" کسی امر کا نتیجہ نہیں بلکہ کتاب یا پھر کتاب ہی کی مانند، خارج میں موجود کسی "امر واقعہ" کا صفاتی نام ہے۔

اسی سورہ (بقرہ) میں ذرا آگے چل کر (آیت نمبر ۱۸۵) یہ لفظ یوں استعمال ہوا ہے۔ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس و بینات من الھدیٰ و الفرقان (الیٰ آخر الایہ) اس آیت میں ھدی للناس ۔ بینات من الھدیٰ ۔ و الفرقان کے بارے میں دو تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق ھدی للناس علم نحو کی رو سے قرآن کا "حال" ہے۔ یعنی قرآن لوگوں کا ہادی و رہنما ہے اور بینات من الھدیٰ بھی قرآن کا حال ہے۔ یعنی اسمیں ہدایت کی کھلی اور روشن نشانیاں ہیں اور الفرقان بھی چونکہ الھدیٰ پر معطوف اور من کے تحت ہے اس لئے یہ بھی قرآن ہی کا حال ہے۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق ھدی للناس، شہر رمضان کی "خبر" ہے۔ مطلب یہ کہ ماہ رمضان، لوگوں کے لئے

© rasailojaraid.com

ہادی و رہنما ہے نیز بینات من الھدیٰ بھی ماہ رمضان کی خبر ہے یعنی اس ماہ میں ہدایت کی روشن نشانیاں موجود ہیں۔ نیز الفرقان بھی ماہ رمضان کی خبر کا آئینہ دار ہے ۔ مطلب یہ کہ اسمیں اچھے اور برے کی، خیرو شر کی، نیک و بد اور حق و باطل کی تمیز ہو جاتی ہے۔ یوں یہ ماہ مبارک لوگوں کے لئے ایک کسوٹی اور میزان بن جاتا ہے۔

اس وضاحت سے آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں فرقان کا لفظ یا تو قرآن کے لئے آیا ہے یا پھر ماہ رمضان کے لئے۔ بہر حال ہر دو معنی میں "فرقان" "موجود فی الخارج شے کا نام ہے۔

اب فرقان کے سلسلۂ بیان کی تیسری آیت ملاحظہ فرمایئے۔

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان (آل عمران/۳)

اور اس نے قبل ازیں توراۃ و انجیل اتاریں جو لوگوں کے لئے ہادی و رہنما تھیں اور اس نے فرقان بھی اتارا۔ اس آیت کے شروع میں فرمایا گیا تھا۔

نزّل علیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ ۔ ال عمران/۳

اس نے آپ پر (اے رسول محترم) خصوصی کتاب اتاری، جو سراسر حق ہے۔ اور جو کچھ ان (یہود و نصاریٰ) کے ہاتھوں میں ہے اسکی مصدق ہے۔

یہاں فرقان کے معنی کو سمجھنے کے لئے پوری آیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ نزل علیک الکتاب ۔ ہم نے آپ پر کتاب اتاری۔ پھر اسی مقام پر یہ فرمایا گیا۔ و انزل الفرقان ۔ ہم نے فرقان اتارا۔

ظاہر ہے کہ ایک ہی آیت میں کتاب و فرقان اتارنے کی جو بات کی گئی ہے وہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۵۳ کی طرح ہر دو حال سے خالی نہیں۔ ایک حال کے مطابق فرقان کا لفظ کتاب کے وصف کو نمایاں کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ بایں معنی یہ قرآن مجید کا صفاتی نام ہوا۔ اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد فرقان کا لفظ لانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ توریت و انجیل کے محرّف ہونے کو واضح کر دیا جائے کہ اب حق و باطل کے مابین فرق قائم کرنے والی کتاب فقط وہی ہے۔ جو اے رسول! آپ پر اتاری گئی ہے۔

دوسرے حال کے مطابق فرقان کا لفظ، حضور نبی کریم ﷺ کے نشانات نبوت کے طور پر آیا ہے جو آپ کی نبوت و رسالت کی سچائی کو مُبرہن کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ظاہر کئے جاتے رہے ہیں۔ بہر حال ان ہر دو معنی کی رو سے "فرقان" "موجود فی الخارج شے کو کہا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

اوراب یہاں نزلنا اور انزل کے حوالہ سے عرض کروں گا۔ آیت میں نزلنا کے دو مفعول بیان ہوئے ہیں۔ مفعول اول آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اور مفعول ثانی، کتاب ہے۔ جبکہ انزل کا مفعول فقط ایک بیان ہوا ہے یعنی فرقان اور اس کا دوسرا مفعول غائب ہے اسلیے مفعول ثانی کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ فرقان کے لفظ سے وہ عقل سلیم یا نور قلب، یا بصیرت ایمانی مراد ہوسکتی ہے، جو آسمانی کتابوں کی روشنی میں بتدریج انسان کو میسر آتی ہے۔ اس معنی کی رو سے "فرقان" موجودفی الخارج کسی شے کا نام نہیں ہوگا بلکہ وہ فیض خداوندی ہوگا، جو اتباعِ وحی کے نتیجے میں انسان کو خدا کی مشیت کے تحت نصیب ہوتا ہے اور وہ اس کی مدد سے حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرلیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ امتیاز پیدا کرنے والی شے داخلی ہی ہوسکتی ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں فرقان کا لفظ یا تو قرآن کے لئے آیا ہے یا پھر حضور نبی کریم ﷺ کے نشانات نبوت کے ثبوت کے لئے آیا ہے یا پھر عقل سلیم، نور قلب اور بصیرت ایمانی کے اثبات کے لئے آیا ہے۔

ہمارے سلسلۂ بیان کی چوتھی آیت یہ ہے۔

وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان۔۔(الانفال/۴۱)

اور جو کچھ ہم نے اپنے بندہ خاص پر یوم الفرقان کو اتارا۔

اس آیت میں فرقان کا لفظ یوم کی اضافت کے ساتھ آیا ہے، جس کا مطلب ہے فیصلہ کا دن۔ یعنی وہ دن، جس نے حق و باطل کے مابین فیصلہ کردیا۔ یہ غزوۂ بدر کا دن تھا۔ جسے آگے چل کر یوم التقی الجمعان بھی کہا گیا ہے۔ یعنی دو گروہوں کے درمیان مڈھ بھیڑ کا دن۔

اوراب پانچویں آیت دیکھئے۔

ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون الفرقان و ضیا و ذکر اللمتقین ۔(الانبیا/۴۸)

اس آیت کے مطابق موسیٰ اور ہارون کو جو کچھ دیا گیا تھا۔ اسے فرقان اور ضیاء کا نام دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہاں فرقان سے مراد موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی ہے، اور ضیاء، ہارون علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی۔ یہ وحی اس لحاظ سے فرقان تھی کہ اس سے حق و باطل میں تمیز قائم ہوجاتی تھی۔ اور ضیاء اس لحاظ سے کہ اسمیں ہر قسم کی ذہنی و اخلاقی، علمی و عملی اور اعتقادی و روحانی ظلمتیں کا فور کرنے کا کماحقہ سامان موجود تھا۔ وحی خداوندی کے یہ دونوں نام ان کے اوصاف کے اعتبار سے ہیں۔ اور اس وحی خداوندی کو ذکر للمتقین اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اس میں انفس و آفاق کے حقائق کی یاد

وہانی اور تذکیر بھی موجود تھی۔

اس وضاحت کے بعد یقیناً آپ جان گئے ہوں گے کہ یہاں فرقان کس معنی میں آیا ہے؟

اوراب ہمارے سلسلۂ بیان کی آخری آیت ملاحظہ فرمائیے۔

تبارك الذی نزل الفرقان علیٰ عبده لیكون للعلمین نذیرا ۔(الفرقان/۱)

تمام برکتوں کی حامل اور اپنی مخلوق کو ہمہ اقسام کی برکتیں عطا کرنے والی ذات کہ جس نے اپنے بندہ خاص پر فرقان اتارا، جو تمام جہانوں کے لئے باعث انذار ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مقام پر "فرقان" سوائے قرآن کے کسی اور معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ یہ وحی (قرآن) خدا کی طرف سے اتاری گئی وہ آخری کسوٹی اور میزان ہے جسکی روشنی میں حق و باطل، خیر و شر، اور صحیح و غلط کے درمیان فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس معنی کی رو سے اسے یہاں "فرقان" کے صفاتی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ لفظ "فرقان" پورے قرآن میں خارج میں موجود کسی نہ کسی حقیقت کے اظہار کے مختلف اسمائے گرامی کے طور پر آیا ہے۔

کہیں وہ انبیائے کرام پر نازل ہونے والی وحی ہے۔ تو کہیں انبیائے کرام کے تعلق سے ظاہر ہونے والا نشان۔۔ کہیں وہ ماہ رمضان کا نام ہے تو کہیں یوم بدر کا نام، اور کہیں وہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی آخری اور محفوظ وحی کا جگمگاتا ہوا صفاتی نام گویا صحیح معنی میں اسم بامسمّیٰ۔

البتہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۹ میں لفظ فرقانا جو آیا ہے وہ اس صلاحیت، خوبی اور قوت کے لیئے آیا ہے۔ جو وحی خداوندی کی رو سے، ہر اس شخص کو میسر آتی ہے، جو قانون خداوندی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اور یہ کمال، تقویٰ کا وہ نتیجہ ہے جو خارج میں موجود کسی حقیقت کا نام نہیں بلکہ اس عقل سلیم اور نور قلب کا نام ہے، جو تقویٰ کی رو سے از روئے مشیت خداوندی، انسان کو میسر آجاتا ہے۔ جسکی روشنی میں وہ تمیز کرنے لگتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ پھر ظاہر ہے کہ اس صحیح اور غلط کی پہچان کے دائرہ فکر و عمل میں وہ تمام علوم اور فنون بھی آجاتے ہیں جنکی بنیاد پر وہ تسخیر کائنات کے پروگرام میں سرگرم عمل ہوجاتا ہے۔ ذہن انسانی کے ارتقائے مستقیم میں یہ صلاحیت، کلیدی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ پھر انسانیت کی نفع بخش اور فیض رسانی کے لئے نت نئی چیزیں وجود پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ بلاشبہ "یہ فرقان" (یعنی صراطِ مستقیم میں ارتقائے انسانی) دراصل خداوند عالم کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں، جنہیں "فرقان" کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

آخر میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ دولت بے بہا صرف انہی لوگوں کے حصے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتی ہے جو قوانین خداوندی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور اسی جذبے سے سرشار ہوتے ہوئے کائنات کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔

کیا چاند گرہن کا وقت ایک منحوس گھڑی ہے؟

سوال: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ چاند گرہن کا وقت ایک منحوس گھڑی ہے اور یہ انسانوں پر ایک کٹھن وقت ہوتا ہے لہٰذا اس وقت کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور کھانے پینے سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ قرآن پاک کی تلاوت کرنی چاہیے اور نوافل ادا کرنے چاہئیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا یہ باتیں درست ہیں یا غلط۔ اگر نہیں تو اسوقت کو گزارنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ (انجینئر شہزاد ندیم۔ دبئی)

میرے محترم! اگر ہن یا گہن سورج کا ہو یا چاند کا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت وقدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ نظام شمسی کا مطالعہ جہاں ہمیں اس امر سے روشناس کراتا ہے کہ سورج یا چاند گرہن کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ وہیں ہمیں اس حقیقت سے بھی متعارف کراتا ہے کہ سورج اور چاند ہر دو دراصل، قانون فطرت کے قاعدوں اور ضابطوں میں کچھ اسطرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرسکتے اور یوں گرہن ایک بڑی نشانی بن جاتا ہے آفتاب و ماہتاب کے مجبور ومقہور ہونے کی، پھر یہ امر آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے کہ جو مجبور محض ہو۔ وہ یقیناً خالق نہیں ہوسکتا چنانچہ یہ گرہن ان ہر دو کے مخلوق ہونے کی زبردست دلیل ہے پس ظاہر ہے کہ جو مخلوق ہو وہ ہرگز لائق پرستش نہیں۔ اسمیں (یعنی گرہن میں) زبردست رد ہے انکا کہ جو شمس وقمر کی پوجا کرتے ہیں اور وہ گرہن کی یہ حکمت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سورج اور چاند، بوقت گرہن بزبان حال پکار پکار کر عالم کائنات کو متنبہ کرتے ہیں کہ "اے ہماری پرستش کرنے والو ہماری چال اور ہمارے حال کو اپنی اپنی قسمتوں پر سعد ونحس ساعتوں کے حوالے سے اثر انداز ہونے کا عقیدہ رکھنے والو! کیوں شرک میں مبتلا ہوتے ہو۔ ہم تو محض تمہاری طرح ایک مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام اپنی عبادات کرانا نہیں بلکہ عبادت کرنا ہے"۔ جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہوا "الشمس والقمر بحسبان (۵۵/۵)" ترجمہ۔ اور سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ (محو گردش) ہیں۔ نیز سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کا چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیفیت سے متعلق ایک سوال اور اسپر رسول پاک ﷺ کا جواب بھی اس ضمن میں ہمیں یوں حقیقت آشنا کرتا ہے۔ "یسئلونک عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس (البقرہ/۱۸۹)۔۔الخ۔ ترجمہ۔

اور یہ لوگ آپ سے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرما دیں کہ چاند کا گھٹنا بڑھنا لوگوں کے لیے ان کے اوقات کی تعیین ہے۔ یعنی لوگوں اور قوموں کی قسمتوں کے بننے اور بگڑنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا اسکے منحوس ہونے کا تصور وعقیدہ، خواہ وہ (یعنی چاند) کسی حال میں ہو۔ ابتدائی تاریخوں میں ہو یا انتہائی تاریخوں میں ایام گرہن میں ہو یا ایام بیض میں، بہرحال سراسر غیر اسلامی وغیر قرآنی تصور وعقیدہ ہے۔

اور اب اس گرہن سے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ "سورج اور چاند، خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ نہ تو ان میں کسی کی موت سے گرہن ہوتا ہے اور نہ کسی کے پیدا ہونے سے۔ پس جب تم گرہن دیکھو تو خدا کو یاد کرو"۔ (متفق علیہ)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جب تم گرہن دیکھو تو خدا سے دعا کرو، تکبیر کہو، نماز پڑھو اور خیرات کرو"۔ (متفق علیہ) حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سورج گرہن ہوا تو رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قیامت کا سا خوف ان پر طاری ہو گیا، پھر آپ مسجد میں تشریف لائے اور نماز پڑھی، جسکا قیام، رکوع اور سجدہ اسقدر طویل تھا کہ میں نے کبھی اتنا طویل قیام، رکوع اور سجدہ نہیں دیکھا پھر آپ نے فرمایا کہ یہ نشانیاں، جنکو اللہ بھیجتا ہے نہ تو کسی کی موت کے سبب سے ہوتی ہیں اور نہ کسی کی پیدائش کا نتیجہ۔ لیکن اس ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم اس قسم کی نشانیوں میں سے کچھ دیکھو تو خدا سے ڈرو اور خدا کا ذکر کرو۔ دعا مانگو اور مغفرت چاہو۔ (متفق علیہ) اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ سورج اور چاند اسوقت گرہن میں آتے ہیں جبکہ دنیا کے سرداروں میں سے کوئی بڑا سردار مر جاتا ہے۔ جان لو کہ سورج اور چاند نہ تو کسی کی موت سے گرہن میں آتے ہیں اور نہ کسی کی پیدائش سے اور یہ دونوں بھی خدا کی مخلوقات میں سے دو مخلوق ہیں۔ خدا اپنی مخلوق میں جو چاہے تغیر کرے۔ پس ان میں سے جب کوئی گرہن میں آئے تو تم نماز پڑھو۔ اسوقت تک جب تک کہ وہ روشن نہ ہو جائے یا خداوند تعالیٰ کوئی حکم ظاہر نہ فرمادے"۔ (سنن نسائی)

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد اب آپ کے سوال کا اجمالاً جواب حاضر خدمت ہے۔ چاند گرہن کو منحوس سمجھنا سراسر غلط ہے۔ اس وقت کو گزارنے کا شرعی طریقہ اوپر احادیث میں مذکور ہوا، اس پر عمل کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحبزادہ شاہ انس نورانی صدیقی

چیئرمین ورلڈ اسلامک مشن، پاکستان

محترم جناب حافظ شکیل اوج صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ روانہ کردہ "التفسیر" کے دوشمارے جنوری تا مارچ اور اپریل تا جون موصول ہوئے۔ یاد فرمائی پر شکر گزار ہوں۔ اللہ رب العزت آپکو اسکا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

آپکی یہ علمی کاوش یقیناً قابل تحسین، لائق صد مبارکباد اور اہل علم کے مطالعہ کے لیے ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو انشاءاللہ آئندہ یہ رسالہ طالب علموں کے لیے بالخصوص اور اہل علم کے لیے بالعموم ایک گرانقدر اثاثہ ثابت ہوگا۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب لبیب ﷺ کے طفیل اسے کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

والسلام

ڈاکٹر محمد محسن نقوی

ممتاز شیعہ عالم دین و محقق

Asalamu-Alaikum!

Brother Shakil Auj!

Thank you for sending me the current issue of "al-Tafseer.' I recieved it on Friday. It looks very informative and thought provoking. May Allah accept your efforts. I would like to contribute some articles to this periodical. I hope to get a positive response from your side. Thanks.

Dr. Mohsin Naqvi

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (انڈیا)

(مئی ۲۰۰۵ء)

جامعہ کراچی کی مجلس التفسیر نے ایک مفید سہ ماہی دینی، علمی اور تحقیقی رسالہ "التفسیر" نکالا ہے، اس کا ابھی پہلا شمارہ شائع ہوا ہے، جب یہ اپنے آغاز میں ہی اتنا ہونہار ہے تو آئندہ اس سے جو توقع بھی کی جائے وہ بے جا نہیں ہوگی، اس کے اکثر مشمولات اگرچہ پہلے کے چھپے ہوئے ہیں لیکن لوگوں کے کمزور حافظے نے ان کو فراموش کر دیا تھا، اس لیے ان کو دوبارہ شائع کرنا علم و دین کی مفید خدمت ہے، انعامی بانڈز کے جواز و عدم جواز پر اہل علم و محققین کے خیالات نقل کر کے مدلل ترجیحی رائے پیش کی گئی ہے، مولانا شاہ محمد جعفر نے بتایا ہے کہ جہیز کتاب و سنت اور کتب فقہ سے ثابت نہیں، یہ قبیح رسم ہندوانہ اثر کا نتیجہ ہے، ایک مضمون میں چاروں آئمہ کے وہ مسائل درج ہیں جن میں شاہ ولی اللہ صاحب نے کسی ایک کی موافقت اور دوسروں کی مخالفت کی ہے، اسی طرح دوسرے مفید علمی و دینی موضوعات پر بھی پر مغز مضامین سے یہ شمارہ آراستہ ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتے ہیں۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے ، علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں ، کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ
(اقبال)

© rasailojaraid.com